Regd. L. No. 7243 Phone, 8[illegible]

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

جولائی 1969

رسول اللہ صلعم نے فرمایا

کسی بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر

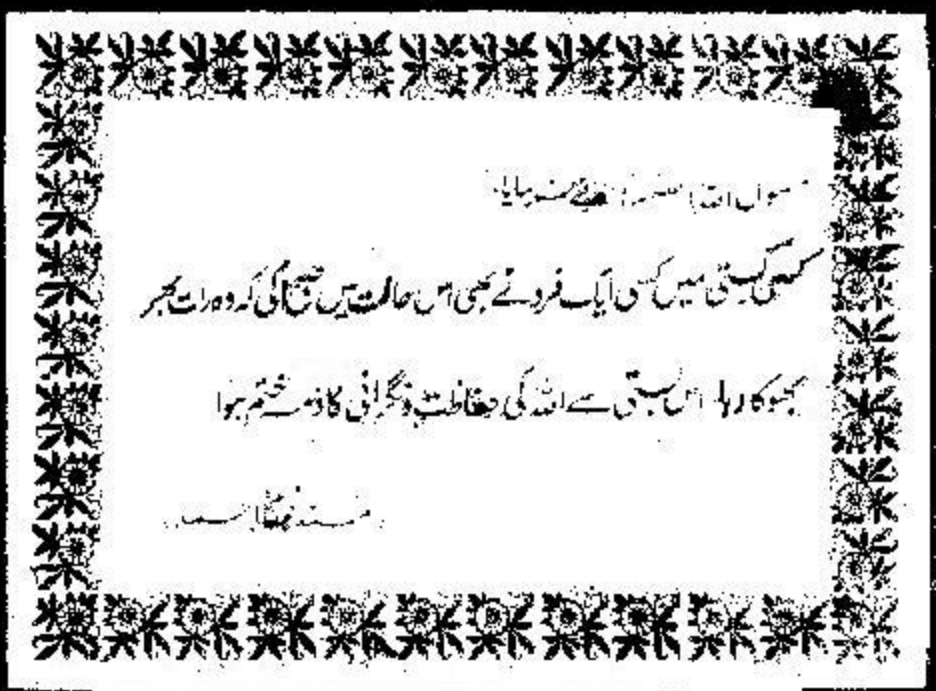

بھوکا رہا اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمہ ختم ہوا

مسند احمد

مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک
سالانہ پاکستان دس روپے
سالانہ ہندوستان چندہ روپے
سالانہ غیر ممالک ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ؛ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد (۲۲) | جولائی ۱۹۶۹ء | نمبر (۷)

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲
۲۔ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ——— (محترمہ ثریا عندلیب) ——— ۱۳
۳۔ کیا اقبال اشتراکی تھا؟ ——— ۱۷
۴۔ نقد و نظر (ذنبِ اکبر) ——— ۳۱
۵۔ المیہ فلسطین اور جماعت اسلامی ——— (شاہد عادل) ——— ۳۳
۶۔ حقائق و عبر ——— (فطرت انسانی)، (اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی)، (شیخ چپ بیٹھے توکل ٹھہرے)، (گھر بیٹھے لطف اٹھایئے) ۵۷
۷۔ طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟ ——— (محترم محمد اسلام صاحب) ——— ۶۵
۸۔ استعمار کا عالمی کردار ——— (محترم خورشید عالم صاحب) ——— ۷۴

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ کم ہوئی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاوشیں
پھر آ گیا وہ زلف پریشاں کئے ہوئے

مستقبل کا مورخ جب تاریخ پاکستان پر نگہ بازگشت ڈالیگا تو اسے ایک حقیقت نمایاں طور پر نظر آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ ایک سیاسی جماعت نے (مذہب کا نقاب اوڑھ کر) تحریک پاکستان کی شدید ترین مخالفت کی۔ جب اس کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا تو وہ (معلوم کیا مقاصد دل میں لئے) پاکستان آ گئی اور یہاں آ کر اس نے اہل پاکستان کو ایک دن بھی چین کی نیند نہ سونے دیا۔۔۔ ہر روز ایک نیا فتنہ۔ ہر دن ایک نیا شوشہ۔ ابھی حال ہی میں اس نے تحریک بحالیٔ جمہوریت کے نام سے ملک میں ایسا خلفشار پیدا کرایا کہ فوج کو نظم و نسق مملکت سنبھالنا پڑا، اور مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ اہل پاکستان نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب کچھ دن تو آرام سے گزر ینگے۔ لیکن یہ جماعت نچلی بیٹھنے والی تھوڑی ہے۔ اس نے اب ایک نیا پٹاخہ چھوڑا ہے کہ فلاں کالج کے اساتذہ کے عقائد خلاف اسلام ہیں اور وہ ان عقائد کا پرچار کر کے طلباء کے دل کو زہر آلود کرتے ہیں اسلئے انہیں کالج سے باہر نکال دینا چاہیئے۔ یہ شوشہ چھوڑا اور اس کے بعد اپنی مخصوص ٹیکنیک کے مطابق، سارے ملک میں پراپگنڈہ کی آگ پھیلا دی۔۔۔ پمفلٹ بازی۔ اخبارات و رسائل میں مضامین کی بھرمار۔ سرگوشیاں۔ مساجد کے خطبات، اور معلوم کن کن اور حربوں سے ملک کے اچھے بھلے سکون میں پھر سے ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس شورش انگیزی کے پیچھے مقاصد کیا ہیں، ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ نہ ہی ہم اس معاملہ کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اساتذہ کون ہیں، ان کے عقائد کیا ہیں۔ کیا وہ واقعی طلباء کے دلوں کو زہر آلود کر رہے ہیں! ہم صرف اصولی گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ مذہبی عقائد کے متعلق احتساب (INQUISITION) کی اس تحریک کے نتائج کس قدر ہولناک اور اس کے عواقب کس قدر پرخطر ہو سکتے ہیں۔ اس مہم کے سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ

(۱) پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے یہاں کوئی بات خلافِ اسلام نہیں ہونی چاہیئے۔

(۲) انجمن حمایتِ اسلام، مسلمانوں کے روپے سے چلتی ہے، اس لئے اسے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔

(۳) اسلامیہ کالج میں اسلامی عقاید کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ جو لوگ خلافِ اسلام عقاید رکھتے ہوں وہ اس کالج سے کس طرح متمسک رہ سکتے ہیں۔

اصولی طور پر ہمیں ان مطالبات سے کامل اتفاق ہے۔ بلکہ ہم تو ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس کے عقاید اسلامی ہونے چاہئیں۔ مسلمان کہلانا اور خلافِ اسلام عقاید رکھنا جمع بین النقیضین ہے۔

لیکن سوال یہ ہے --- اور یہ سوال بڑا اہم ہے --- کہ ہمارے پاس وہ معیار کون سا ہے جس کے مطابق یہ پرکھا جائے کہ فلاں عقیدہ اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اور وہ اتھارٹی کون سی ہے جسے اس قسم کا چیلنج دینے یا فیصلہ کرنے کا حق پہنچتا ہے؟ اس قسم کے معیار کی عدم موجودگی میں احتسابِ عقاید کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو خود مسلمانوں کے خون سے رنگین نہ ہو --- ایک خیال ابھرتا ہے کہ قرآن قدیم نہیں مخلوق ہے۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ یہ عقیدہ خلافِ اسلام ہے۔ پھر کیا ہے۔ بغداد کی نالیاں مسلمانوں کے خون سے بھر جاتی ہیں۔ کسی کو کوڑوں سے پٹوایا جاتا ہے کسی کو قید و بند کے شکنجوں میں کسا جاتا ہے۔ کسی کی کھال کھینچی جاتی ہے۔ کسی کے سینے کو سوہان (ریتی) سے رگڑا جاتا ہے۔ کسی کو عید قربان کے دن دنبے کے عوض ذبح کیا جاتا ہے۔ کبھی ایک طرف کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دوسری طرف کا۔ اور خونریزیوں اور بلا انگیزیوں کی یہ قیامت سالہا سال تک برپا رہتی ہے۔ ایک سوال ختم ہوتا یا ماند پڑتا ہے تو اسی نوعیت کا کوئی دوسرا سوال ابھر آتا ہے۔ پھر وہی سلسلۂ احتساب شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہی خوں ریزیاں اور بلا انگیزیاں وجۂ ہلاکتِ امت بن جاتی ہیں --- غرضیکہ ہماری ساری تاریخ اسی قسم کی ہنگامہ خیزیوں کا مجموعہ ہے۔ ان ہنگاموں میں امن و سکون کس طرح نذرِ آتش ہو جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک وقت آگیا تھا جب مصر میں ہر شخص کو اپنی جیب میں اس قسم کا فتویٰ رکھنا پڑتا تھا کہ اس کے عقاید درست ہیں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کا فیصلہ یہ ہے کہ جس مسلمان کے عقاید غیر اسلامی ہو جائیں وہ مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس کا خون مباح ہو جاتا ہے --- نتیجہ یہ کہ آج ایک فرقہ کے ہاتھ میں اقتدار آگیا تو اس نے دوسرے فرقہ کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ کل حالات نے پلٹا کھایا اور اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا تو اس نے فریقِ اول کو کافر

(فلہذا مرتد اور واجب القتل قرار دے دیا۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو ــــ پھر سن لیجئے کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو ــــ اور کسی فرقہ کے خلاف کفر کے فتویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اس فرقہ سے متعلق (یعنی ایسے عقاید رکھنے والا) ہر شخص کافر ہے۔ اس معیار سے دیکھئے تو خود انجمن حمایت اسلام کے ارباب حل و عقد میں سے ہر شخص کفر کے فتوے کی زد میں آجائے گا۔ زیر نظر احتساب کے لئے جو تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی ہے اس کے ہر رکن کے دامن پر کفر کے فتویٰ کا داغ ہوگا۔ خود جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے خلاف مختلف گوشوں سے کفر، الحاد اور ارتداد کے فتاوے لگ چکے ہیں۔ (مثلاً) دارالعلوم منظر الاسلام۔ بریلی کی طرف سے ان کے متعلق کہا گیا کہ

> یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں۔ یہ وہی پرانی خارجیت ہے جو نئے روپ اختیار کر چکی ہے۔

مفتی مظہر اللہ صاحب (جامع فتحپوری۔ دہلی) نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ

> ان باتوں کا ظاہر تو یہی ہے کہ مسلم کو اہل سنت سے خارج کرنے والی ہیں اور یقیناً تفریق بین المسلمین کی موجب اور نئے فرقے پیدا کرنے کی بنیاد ہے۔ لیکن بنظر تعمق نظر کیجئے تو کفر تک پہنچانے والی ہیں ــــ ایسی صورت میں نیا فرقہ پیدا کرنے والی نہیں، بلکہ مرتدین میں داخل کرنے والی ہیں۔

مفتی سید مہدی حسن، صدر مفتی، دارالعلوم دیوبند اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں

> اگر کوئی شخص مسجد کا امام مودودی صاحب کا ہم خیال ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے مودودی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

> آپ کی تحریک اسلامی، خلف سلف صالحین مثل معتزلہ، خوارج، روافض، جہمیہ وغیرہ فرق قدیمہ اور مثل قادیانی، چکڑالوی، مشرقی، نیچری، مہدوی، بہائی۔ وغیرہ فرق جدیدہ ایک نیا اسلام لانا چاہتی ہے اور وہ ان اصول و عقاید پر مشتمل ہے جو کہ اہل سنت اور اسلاف کے خلاف ہیں۔

مولانا احمد علی (مرحوم) کی جمعیت علماء (لاہور) نے مودودی صاحب کے متعلق ایک اشتہار میں لکھا تھا۔

> ان کا اجتہاد قرآن کے مقابلہ میں شیطنی ہے ۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مودودی صاحب اور اس نام نہاد جماعت کے شر سے بچائے۔

لہذا اگر احتساب عقاید کی بات چل نکلی تو "اور تو اور" خود جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو اپنا مسلمان ہونا ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۵۳ء کے ہنگاموں (اور مارشل لاء) کے بعد جب "منیر کمیٹی" کا انعقاد عمل میں آیا تھا تو اس نے ملک کے علماء کرام سے کہا تھا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تو اس سوال کا جواب ہی نہ دے سکے۔ جنہوں نے جواب دیا، ان میں سے کسی کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ ان کے جوابات کی روشنی میں کمیٹی نے لکھا تھا کہ

> یہ جوابات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں سوائے اس کے کہ ان فاضل علماء میں سے کوئی دو بھی اس اصولی مسئلہ کے جواب میں متفق نہیں (کہ مسلمان کسے کہتے ہیں) اگر ہم اپنی طرف سے مسلمان کی کوئی تعریف پیش کریں اور وہ تعریف ان علماء کے فرمودات سے مختلف ہو تو ہم فوراً دائرہ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ہم ان علماء کی بیان کردہ تعریف میں سے کسی ایک کو صحیح تسلیم کرلیں تو ہم صرف اس عالم کے نزدیک مسلمان ٹھہریں گے، باقی تمام کے نزدیک کافر قرار پا جائیں گے۔ (صفحہ ۲۱۸)

سوال یہ ہے کہ کیا جماعت اسلامی یہاں پھر ۱۹۵۳ء کے سے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کو اپنے "اور اپنے ہم نواؤں کے سوا" کوئی معیاری مسلمان نظر ہی نہیں آتا۔ اس باب میں ان کے نشتر کی زد دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ بعض اوقات اتنی دور تک کہ اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ وہ "اور تو اور" اس ذاتِ اقدس و اعظم جن کی طرف نسبت کرنے سے ہم مسلمان قرار پاتے ہیں، پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ احادیث دجال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔
>
> (رسائل و مسائل جلد اول۔ مطبوعہ ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۵)

آج کے زمانے کے مسلمانوں کا معیاری ہونا تو ایک طرف، مودودی صاحب کے نزدیک، عہد نبویؐ کے عام مسلمان بھی معیاری نہیں تھے۔ وہ اپنی کتاب تفہیمات حصہ اول۔ میں لکھتے ہیں۔

> حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبویؐ میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔
>
> (شائع کردہ۔ دفتر ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ۔ لاہور صفحہ ۳۴۳)

جس زمانے میں جماعت اسلامی نے ملک کے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا ان کے امیر

کہا انہوں نے یہ تھا کہ کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا شریعت کی رُو سے جائز نہیں۔ کسی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ایسا کہتے ہیں حالانکہ حضرت علیؓ نے خلافت کے لئے اپنے آپ کو خود بطور امیدوار پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا کہ

> آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی۔ مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام[1]۔ بابت دسمبر ۵۸ء۔ صفحہ ۷۵)

بات لغزشوں تک ہی محدود نہیں۔ مودودی صاحب کے نزدیک نبی اکرمؐ کے صحابہؓ میں سے بعض آپؐ کے بعد (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ "رسائل و مسائل"۔ حصہ سوم۔ (مطبوعہ مئی ۱۹۶۵ء) کے صفحہ ۲۱۲ پر لکھتے ہیں۔

> یہ معاملہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں صحابہ کے زمرے میں شمار ہوتے تھے مگر آپؐ کے بعد مرتد ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے۔ ان کے متعلق مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

> ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہیں تھے جو ان کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا[2]۔

(تجدید و احیائے[3] دین۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۲۸۳)

---

[1] اس وقت مودودی صاحب کی تحریر کا اصل حوالہ ہمارے سامنے نہیں، ہم اسے عند الضرورت دوسرے وقت پیش کر دیں گے۔

[2] حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی رسوائے عالم کتاب "خلافت و ملوکیت" میں ایسی زہر فشانی کی ہے جس کا آج بھی [illegible] زد ہے۔

[3] صفحہ آئندہ پر۔

صحابہ کبارؓ اور خلفائے راشدین سے آگے بڑھیئے تو اسی قسم کی تنقیص بزرگانِ سلف کے متعلق ملے گی۔ مثلاً وہ شاہ ولیؒ اللہ اور مجدد سرہندیؒ کے متعلق لکھتے ہیں۔

اب شاہ ولی اللہ صاحب اور مجدد سرہندی رحمہا اللہ کے دعووں کو لیجئے۔ ان دونوں بزرگوں کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کے اعتراف کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان کا اپنے مجدد ہونے کی خود تصریح کرنا اور بار بار کشف والہام کے حوالہ سے اپنی باتوں کو پیش کرنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ سوم۔ مطبوعہ مئی ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۲۵۷)

ظاہر ہے کہ جب بزرگانِ دین کے متعلق ان کے مالک کا یہ عالم ہے تو عام مسلمان بیچارے کس قطار شمار میں ہو سکتے ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے سلسلہ میں جو کچھ کہا تھا وہ انکی ذہنیت و انانیت کا آئینہ دار ہے۔ مثلاً

یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے (۹۹۹) فی ہزار نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلئے یہ مسلمان ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۷)

وہ ان "پیدائشی مسلمانوں" کو نا مسلم ہی نہیں بلکہ جانور کہتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیںگے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیںگے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل کوے۔ گدھ۔ تیتر۔ بٹیر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک "پرندہ" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ۲۶)

لہٰذا "ان مسلمانوں پر مشتمل جو جمہوری حکومت قائم ہوگی" وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔"

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۲۹)

یہ تھا ان کا فیصلہ عام مسلمانوں کے متعلق۔ باقی رہے ان کے خواص سو انکے متعلق ارشاد تھا کہ

---

۳ (حاشیہ صفحہ گزشتہ) مودودی صاحب نے "تجدید و احیاءِ دین" میں بزرگانِ سلف میں کسی کو بھی اپنے تنقیدی نشتروں سے محفوظ نہیں رہنے دیا۔

ان کے خیالات۔ نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۲۶)

خود قائد اعظمؒ کے متعلق ارشاد تھا،

افسوس کہ لیگ کے قائد اعظمؒ سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ ص ۳۳)

---(۱)---

سوال یہ ہے کہ جب مودودی صاحب کے نزدیک "پیدائشی مسلمانوں" کے عوام یا خواص میں سے کوئی بھی ان کے معیار اسلام پر پورا نہیں اترتا، تو پھر مسلمان ہونے کے لئے شرط کیا قرار پائے گی۔ اس کے لئے شرط یہ قرار پائیگی کہ وہ مودودی صاحب کے ہاتھ پر از سر نو مسلمان ہو کر جماعت اسلامی میں شامل ہو جائیں۔ دیکھئے "وہ جماعت اسلامی کی تشکیل" کے عنوان سے ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۶۱ھ۔ (ص ۳۲ پر) کیا لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمہ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اُسکے طرز خیال و طرز زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ کہنے کی جرأت کرے گا وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سر نو ایمان لائے۔

پیدائشی مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع میں جوشیلی تقریر کے بعد لوگوں سے شہادت کا مطالبہ کرنا صحیح طریقہ نہیں ہے، کیونکہ دین آبائی سے جو رد ابتی دلچسپی اُنکے اندر موجود ہے اسکی بنا پر وہ کسی احساس ذمہ داری کے بغیر بلا تامل کلمہ پڑھ دینگے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرداً فرداً ان کے سامنے کلمہ کے مفہوم کو اسکی ذمہ داریوں اور مقتضیات کے ساتھ بیان کیا جائے، اور جب وہ

سوچ سمجھ کر شہادت ادا کریں تب انہیں جماعت میں داخل کیا جائے۔

چنانچہ جب جماعتِ اسلامی کی پہلے پہل تشکیل کی گئی تو اس میں شامل ہونے والوں کو مودودی صاحب نے کلمۂ شہادت پڑھوا کر از سرِ نو مسلمان کیا تھا۔ (غور فرمایا آپ نے کہ مودودی صاحب نے اپنے لئے کونسا مقام تجویز فرما رکھا ہے؟)۔

اب آپ نے دیکھ لیا کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک اسلام کا معیار کیا ہے اور کسی کے عقاید کے اسلامی معیار پر پورا اترنے کا مفہوم کیا؟ یعنی جو شخص اس جماعت سے متفق ہے وہ مسلمان ہے جس کے خیالات ایسے نہیں، اس کے عقاید اسلام کے خلاف ہیں۔ چنانچہ یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق انہوں نے ملک میں سے "صالحین" کو چن کر الگ کر لیا ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے جولائی ۱۹۵۵ء میں سرگودھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اس وقت جماعتِ اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے اس ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ، غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت کا کوئی کام انکے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و قرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں قوم کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابلِ اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابلِ اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ (بحوالہ الاعتصام - ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء)

یوں تشکیل ہوتی ہے صالحین کی یہ جماعت جس امیر نے ان لوگوں کو از سرِ نو مسلمان کر کے جماعت میں شامل کیا تھا، اس کا مقام کیا ہے، اسکے متعلق بھی خود انہی کی زبانی سن لیجئے۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزء ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اسکے

جائز احکام کی اطاعت کرتے ورا صل اسکی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔　　(ہدایات صفحہ ۳۷)

دوسرے مقام پر ہے :-

جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ وسفید کے اختیارات ہونگے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہونگے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اسلئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس کے ساتھ اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔　　(اسلام کا نظریہ سیاسی - صفحہ ۵۱-۵۲)

ان تصریحات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ احتساب عقاید کے متعلق جماعت اسلامی کی موجودہ تحریک جو بظاہر بڑی معصوم سی دکھائی دیتی ہے کس قدر خطرناک عزائم کی طائر پیش رس ہے۔ یہ درحقیقت آغاز ہے اس عمل تطہیر کا جس کے انجام کے متعلق مودودی صاحب نے واضح طور پر لکھ رکھا ہے کہ جب ملک میں "اسلامی نظام" قائم ہو جائے گا۔ یعنی اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے گا۔ اسلئے کہ جب ملک میں ان کی جماعت کے علاوہ کوئی معیاری مسلمان ہی نہیں تو ان کے سوا اسلامی نظام قائم کون کر سکیگا — تو اس وقت اس مسئلہ کا حل یہ ہوگا کہ یہاں کی

مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونیکا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائیگا، تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائینگے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا، اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھیگا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف

ایسے مسلمانوں سے کیا جاتا ہے جو اسلام پر راضی ہوں۔

(مرتد کی سزا ۔ از ابوالاعلیٰ مودودی ۔ مطبوعہ اگست ۱۹۵۲ء ص ۲۰)

جماعتِ اسلامی کی چالیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ ان کے اندر چھپے ہوئے خطرات کو بھانپنے کے لئے تگ و دو رس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی موجودہ تحریک کے متعلق لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ محض اسلامیہ کالج کے چار اساتذہ کے عقاید کی تحقیق کا معاملہ ہے اور اس پر غور ہی نہیں کیا کہ اس کے مضمرات کیا ہیں۔ جماعتِ اسلامی درحقیقت یہ مقام حاصل کرنا چاہتی ہے کہ کسی شخص کے مسلمان، یا کسی قانون اور مسلک کے اسلامی ہونے کے متعلق ان کا سرٹیفکیٹ درکار ہو۔ اب آپ سوچ لیجئے کہ اس صورتِ حال کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ موجودہ تحریک کے ساتھ ہی مودودی صاحب نے سیاسی جماعتوں کے لئے ایک "ضابطۂ اخلاق" کا خاکہ پیش کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ سیاست میں حصہ لینے والوں کے لئے ضروری ہوگا کہ

نظریۂ پاکستان (یعنی اسلامی نظامِ حیات اور ملکی سالمیت) کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔

(مطبوعہ مشرق ۔ ۱۵ر جون ۱۹۶۹ء)

یعنی جو شخص یا جو جماعت بھی سیاست میں حصہ لینا چاہے، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ مودودی صاحب سے سرٹیفکیٹ حاصل کرے کہ اس کا کوئی کام "اسلامی نظام" کے خلاف نہیں۔ لیکن بات یہیں تک نہیں رکے گی اس سے بھی آگے بڑھے گی۔ دستورِ پاکستان کی رُو سے صدرِ پاکستان کے لئے "مسلمان" ہونا بنیادی شرط ہے۔ آج اس جماعت نے جو سوال اسلامیہ کالج کے چار اساتذہ کے خلاف اٹھایا ہے، اس میں اگر انہیں کامیابی ہو گئی تو کل کو وہ صدارتِ پاکستان کے منصب کے امیدوار کے متعلق بھی یہ سوال اٹھائیں گے کہ اس کے عقاید اسلامی نہیں ہیں ۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے معیارِ اسلام کے مطابق صحیح اسلامی عقاید اُسی کے ہوں گے جو ان سے متفق ہوگا۔

یہ ہیں اس (بظاہر) معصوم سی تحریک کے وہ مضمرات جن کے پیشِ نظر ہم نے ضروری سمجھا کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ کی بالعموم، اور اربابِ بست و کشاد کی بالخصوص توجہ اس کی طرف مبذول کرائیں اور ان کی خدمت میں گزارش کریں کہ اگر اس سازش کا تدارک ابھی سے نہ کیا گیا تو آگے چل کر یہ ملک کے لئے بہت بڑی تباہیوں کا موجب بن جائے گی۔ یہ جماعت یہاں اس قسم کا تھیاکریٹک نظام قائم کرنا چاہتی ہے جس میں آخری اقتدارِ مملکت ان کے ہاتھ میں رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اہلِ پاکستان یہاں اس قسم کی پوزیشن پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ آپ دیکھئے کہ جماعتِ اسلامی نے اس سلسلہ میں ٹیکنیک کیا اختیار کر رکھی ہے۔ پہلے انہوں نے اشتراکی اور غیر اشتراکی کا سوال کھڑا کر کے یہ خیال عام کیا کہ اشتراکی خیالات رکھنے والوں کے عقاید خلافِ اسلام ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے چار اساتذہ کو نشانہ بنا کر اسے بطور طاقت آزمائی (TEST CASE) اٹھایا ہے۔ اگر اس پر انجمن کے ارباب

بحث وکشاد دب گئے اور حکومت خاموش رہی تو پھر یہ اس کمیٹی کو بطور نظیر پیش کرکے، جہاں جی چاہے ایسی صورت پیدا کرتے جائیں گے تا آنکہ ان کا ہاتھ صدارتِ پاکستان کے امیدوار کے گریبان تک جا پہنچے گا۔ اس ضمن میں ان کی طرف سے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کیا کسی اشتراکی حکومت میں اس کا امکان ہے کہ اشتراکی اداروں میں ایسے لوگ بار پاسکیں جن کے خیالات غیر اشتراکی ہوں۔ یہ درست ہے کہ وہاں ایسا نہیں ہو سکتا لیکن اول تو یہ کہ اشتراکی حکومتوں میں اشتراکیت کا مفہوم متعین ہے اور ان کے پاس یہ جانچنے کا خارجی پیمانہ موجود ہے کہ فلاں عقیدہ اشتراکیت کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ ان کے برعکس ہمارے ہاں (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اسلام کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں۔ اسلئے اس امر کے جانچنے کا کوئی معیار نہیں کہ فلاں عقیدہ اسلام کے مطابق ہے یا اسکے خلاف۔ دوسرے یہ کہ اشتراکی حکومتوں میں اس قسم کا احتساب صرف حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی جماعت یا پارٹی کو اس کا مجاز قرار نہیں دیا جاتا کہ وہ دیگر افراد کے عقاید کا محاسبہ کرے۔ اگر جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ یہاں بھی کوئی محکمہ احتساب قائم ہو تو اسے چاہیئے کہ حکومت پاکستان کے پاس اس قسم کی تجویز بھیجے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حکومت پاکستان اس قسم کی خار دار وادی میں، جہاں (بحالاتِ موجودہ) اترتے ہوئے، فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں، قدم رکھنا مناسب سمجھیگی۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے گی تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اسلام کا ایک متفق علیہ اور مستند مفہوم متعین کرے اور ایسا ہونا اس ملک (بلکہ مسلمانوں کے موجودہ ممالک) میں، جہاں اتنے فرقے موجود ہیں، ممکن نظر نہیں آتا۔

جہاں تک کسی کے خیالات کا زبردستی محاسبہ کرنے کا تعلق ہے، ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے، خود امیر جماعت اسلامی کی تفسیر قرآن کا ایک اقتباس پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔ اس کا ترجمہ مودودی صاحب نے کیا ہے ـــ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے ـــ اور اس پر حسب ذیل تشریحی نوٹ دیا ہے۔

> یہاں "فتنے" کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں انگریزی کا لفظ (PERSECUTION) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات ونظریات کی جگہ کچھ دوسرے خیالات ونظریات کو حق پاکر قبول کر لیا ہے اور وہ تنقید و تبلیغ کے ذریعے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ آیت کا منشاء یہ ہے کہ بلاشبہ انسانی خون بہانا بہت بُرا فعل ہے لیکن جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری استبداد دوسروں پر مسلط کرے اور لوگوں کو قبول حق سے بجبر روکے اور اصلاح وتغیر کی جائز اور

معقول کوشش کا مقابلہ دلائل سے کرنے کی بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزورِ شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ طبع ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۱۵۰)

کیا جماعتِ اسلامی' ان اساتذہ کے خلاف احتساب کا محاذ قائم کرکے' اسی "فتنہ" کے جرم کا ارتکاب نہیں کر رہی جسے اس نے قتل سے بھی زیادہ بڑا قرار دیا ہے۔ اور کیا وہ پسند کرے گی کہ اسے اس جرم کی وہی سزا ملے جسے اس کے امیر نے' قرآن کی روشنی میں' خود تجویز کیا ہے؟

اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور

بحمد اللہ کہ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیرِ اہتمام مجوزہ کالج کی اسکیم بڑے امید افزا حالات میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تک یہ اسکیم کالج کمیٹی کے زیرِ غور رہی لیکن اب اسکی بڑھتی ہوئی وسعتوں کے پیشِ نظر ضروری سمجھا گیا کہ ملک کے دیگر اربابِ فکر و نظر کی مشاورت سے بھی استفادہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ۲۲ جون کو (پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کے بعد) ایک مجلسِ مشاورت کا انعقاد عمل میں آرہا ہے جس میں اس اسکیم کے مختلف عملی پہلوؤں پر غور و خوض کیا جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ اسکے نتائج بڑے مفید اور دور رس ہونگے اور ان کی روشنی میں یہ اسکیم بہت جلد عملی پیکر اختیار کرے گی۔ مجوزہ کالج اپنی نوعیت کی پہلی درسگاہ ہوگی جس میں

(۱) عام تعلیم یونیورسٹی کے نظام کے مطابق ہوگی تاکہ اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء' زندگی کے عملی میدان میں' دوسرے کالجوں کے طلباء سے کسی طرح بھی پیچھے نہ رہیں۔

(۲) لیکن اسکے ساتھ اس میں قرآن کریم کی پیش کردہ مستقل اقدار کی تعلیم اس انداز سے دی جائیگی کہ طلباء زندگی کے عملی مسائل کو ان کی روشنی میں سمجھنے اور حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔

(۳) چونکہ اسکا تعلق کسی مذہبی فرقہ سے ہوگا نہ سیاسی جماعت سے' اس لئے اس میں اسلام کا وہی تصور پیش کیا جائے گا جو عہدِ رسالتمآب میں' جب مسلمانوں میں ہنوز کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا' وجہ تابانیٔ عالم ہوا تھا۔

(۴) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں طلباء کی تربیت اس انداز سے کی جائیگی جس سے ان کے قلب و نگاہ صحیح قرآنی سانچے میں ڈھل جائیں اور ہم انہیں دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکیں۔ یہی وہ نوجوان ہونگے جو ملت کے مقدر کے درخشندہ ستارے بن سکیں گے۔

امید ہے کہ طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں ہم اسکی مزید تفاصیل پیش کر سکینگے۔ والسلام،

(شیخ سراج الحق' سیکرٹری۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی
۲۵ ر بی۔ گلبرگ۔ لاہور

محترمہ ثریا عندلیب

اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ

۲۹ رمئی کی صبح 'بزمِ طلوعِ اسلام' لاہور کے زیرِ اہتمام '۲۵۔ بی گلبرگ' میں 'عید میلاد النبیؐ' کی تقریب سعید بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی۔ اس دفعہ اس میں خطابات کا موضوع تھا۔ انقلابِ محمدیؐ — محترم پرویز صاحب کا خطاب جون کے شمارہ میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ محترمہ بہن ثریا عندلیب کا مقالہ ہدیۂ قارئین ہے۔ (طلوعِ اسلام)

میرے لئے یہ امر باعثِ صد تشکر و امتنان ہے کہ عید میلاد النبیؐ کے اس مبارک موقع پر قرآنی احباب کی اس محفل میں ہمارے مفکرِ قرآن بابا جی نے مجھے محسنِ انسانیت سرورِ کائنات رسولِ خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر و اعظم کے پہلوئے بشریت پر اظہارِ خیال کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس ذرہ نوازی اور حوصلہ افزائی کے لئے میرا دلی شکریہ قبول کیجئے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا اس اہم اور عظیم موضوع پر قرآن کریم کی روشنی میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے۔ لیکن اپنے مشفق معلمِ قرآنی کے زیرِ تعلیم رہتے ہوئے زندگی کے ابتدائی دور سے جو رہنمائی ملتی چلی آرہی ہے اور اس کی بدولت اللہ اور اس کے رسول کو سمجھنے کی جو قدرے توفیق ارزانی ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس عظیم المرتبت پیکرِ انسانیت' افضل ترین انسانؐ کے یومِ ولادت کی بابرکت و سعادت تقریب پر اس ذاتِ گرامی قدر کے اس مقامِ اعلیٰ کا تذکرۂ جلیل کیا جائے جس کی شہادت خود خالقِ کائنات یہ کہہ کر دیتا ہے کہ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ۔ یعنی محمدؐ انسانیت کے بلند ترین مقام پر ہیں۔ شرفِ انسانیت کی یہی وہ صبحِ بہار تھی جو کل نوعِ انسانی کے لئے امن و سلامتی کا سچا پیام لائی اور جس کی آمد سے انسانیت کی بنجر زمین پھر سے لہلہاتا گلزار بن گئی۔ اس عظیم انقلاب کے لئے خدائے ذوالجلال نے اس ذاتِ اقدسؐ کو اپنا آخری نبی منتخب کیا۔ جسے یہ ہدایت ملی کہ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ۔ ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں صرف اس فرق کے ساتھ کہ میری طرف خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔

اور قرآن نے خدا کا یہ فرمان بھی سنا دیا کہ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۔ اور جسے نے تمہیں تمام نوعِ انسان کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کے دو گوشے عالمِ انسانیت کے سامنے آتے ہیں۔ یعنی ایک بشریت اور دوسری نبوت۔ نبوت کا مقصد وحی خداوندی کو پا کر دوسرے انسانوں تک پہنچا دینا تھا۔ وَبَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ ۔ اور مقامِ بشریت پر ہوتے ہوئے حضور رسالتمآبؐ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ خود وحی کا اتباع کر کے تمام بندگانِ خدا کے لئے ایک مکمل عملی نمونہ پیش کریں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ہر فرد، فکر و تدبر کے ساتھ، اس اسوۂ حسنہ کی بہ طریق احسن پیروی کر سکے اور یوں صراطِ مستقیم کا راہی بن سکے۔ زمانہ شاہد ہے اور دنیا جانتی ہے کہ رسول کریمؐ کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ مقدسہ کی ہر ہر ساعت اس فریضہ خداوندی کو بجا لانے میں گزری اور انہوں نے بشر کی حیثیت میں خود اس طرح اتباعِ وحی کیا کہ اس کی تربیت سے قلیل مدت میں ایسے رفقاء کار کی جماعت تیار ہو گئی جس کے ہاتھوں وہ انقلابِ عظیم رونما ہوا جو منشاءِ الٰہی تھا جس کی خاطر اس کائنات کی تخلیق ہوئی تھی۔ وحی کے اتباع سے مقصود نظامِ خداوندی کا قیام اور قرآنی معاشرہ کی تشکیل تھا۔ خدا کے آخری رسولؐ نے ہر موقع پر اپنی بشریت کا اعلان کرتے ہوئے وحی کی پیروی کرنے کا نتیجہ دنیا کو دکھا دیا اور یہ حقیقت بتا دی کہ جو انسان بھی اس وحی کی رہنمائی میں قدم اٹھائے گا وہ اس قسم کا انقلاب پیدا کر سکیں گے۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی انسان کو مافوق البشر قوت عطا ہوتی ہے۔ انقلاب ہمیشہ انسانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وحی کے متعین کردہ اصولوں سے انحراف نہ کیا جائے۔

بشریتِ رسول کی اہمیت کو قرآن نے بہ تکرار بیان کیا ہے اور اس میں یہی بلیغ نکتہ پنہاں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ایک انسان تھے اور ابلاغِ وحی کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا، بشریت کی امکانی قوتوں کی بنا پر کیا اور انہیں خدا کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے مومنین کی جماعت کے ساتھ ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو انسانوں کے لئے لازم ہو سکتے ہیں۔ اس سعی و عمل اور جد و جہد میں عام انسانوں کی طرح مصائب و موانعات کا بھی سامنا ہوا، میدانِ جنگ میں زخم بھی کھائے۔ خود آپ کی اپنی ذات کو بھی تکالیف پہنچیں۔ انسانی تدابیر میں غلطیاں بھی ہوئیں۔ پھر ان کا ازالہ بھی انسانی تدابیر سے کیا گیا اور آنحضورؐ کی زندگی کے یہ تمام گوشے قرآن میں اس لئے ابدی طور پر محفوظ کر دیئے گئے ہیں تاکہ آپ کی بشریت ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہے اور کسی کو یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے کہ وحی کے بعد عملی انقلاب مافوق البشر قوتوں کے زور پر ہی رونما ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے

کہ کفر کے اندھیروں میں نورِ حق کا یہ انقلاب تنہا رسولؐ کی ذات سے وجود میں نہیں آیا۔ بلکہ آپ کے رفقائے کارؓ آپ کے ساتھ شریک تھے۔ محمد رسول اللہ والذین معہ کے یہی الفاظ اس کی شہادت دیتے ہیں اور اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ وہ خالص وحی کی اطاعت گزار تھی۔ یہاں تک کہ خود نبی کریمؐ بھی کسی وقت کوئی حکم دیتے تو افرادِ جماعت یہ دریافت کرنے کے مجاز ہوتے کہ وہ حکم وحی کی بنا پر ہے یا حضورؐ کا ذاتی ارشاد ہے۔ اور ذاتی ارشاد کی صورت میں اس حکم کو بطور رائے قبول کیا جاتا۔ تاریخ میں اس امر کی نشاندہی موجود ہے۔ خود خداوند کریم قرآن حکیم میں رسول کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ آپ اس تحریکِ انقلاب سے متعلقہ امور میں اپنی جماعت سے مشورہ کر لیا کریں۔ وشاورھم فی الامر۔ وحی کے بعد تمام امور میں آپ کے بشر ہونے کی قرآن کی اس نصِ صریح سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ یعنی میں تمہارے جیسا انسان ہوں کہنے کے اندر بڑا راز اور گہرا فلسفہ یہی تھا کہ اگر وہ فوق البشر ہوتے تو وہ دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ نہیں بن سکتے تھے۔ اور سیرت و کردار کے جو مظاہرے آپ کی ذات سے ہوئے وہ اسی لئے کہ ہر انسان ایسا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اسی انسانی کردار اور انہیں بشری قوتوں سے وہ انقلاب عمل میں آتا اور وہ قرآنی معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو مومنین کا مقصودِ حیات ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالٰے نے اپنے رسول کے انسان ہونے پر جو زور دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت اس تعلق سے مقامِ انسانیت کو ارفع و اعلےٰ بنانا تھا۔ بشریت کا ایسا بلند مقام کہ اس سے قبل زمانہ جاہلیت میں کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رسولؐ اللہ اور آپ کی جماعت نے جو بے نظیر انقلاب برپا کیا اس نے دنیا کو بتا دیا کہ یہ چیز ممکناتِ انسانی کی ہے اور حیطۂ بشریت سے باہر نہیں۔ یوں رسولؐ اکرم کا بشر ہونا شرفِ بشریت کی دلیل اور معراجِ انسانیت کی سبیل بنا۔ آدمیت کو وہ سرفرازی نصیب ہوئی جس کے لئے آدم کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کی آیۂ مبینہ اسی صداقت کی ترجمان ہے کہ شخصیت پرستی کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اصول پرستی حیاتِ جاودانی کا سبب بنتی ہے۔ وہ عظیم ترین اور بلند ترین انسان کہ جس کے رتبے کو دنیا کا کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکتا اور جس کی عظمت اس شان کی حامل ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اس کے تعلق سے بھی شخصیت پرستی نہیں ہو سکتی کیونکہ اسلام کا نظامِ حق و صداقت اپنی داخلی قوتوں کے زور پر آگے چلنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ شخصیتوں کا وابستہ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک کی وفات سے سارے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسا کہ خدا نے خود فرمایا کہ تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اب رسولؐ تو ہم میں ہی نہیں اسلئے یہ انقلاب کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلئے ہمیں پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ جانا چاہیئے اور جب رسولؐ اللہ کی وفات پر سب لوگ غم و مایوسی سے بے قابو ہونے لگے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے منبرِ نبویؐ پر کھڑے ہو کر مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگو! (باقی صفحہ ۵۵ پر)

کیا اقبالؒ اشتراکی تھا؟

آجکل ہمارے ہاں یہ موضوع بڑی شدت سے مرکزِ بحث و جدل بن رہا ہے کہ علامہ اقبال اشتراکی تھے یا نہیں۔ ایک فریق انہیں بدلائل و شواہد اشتراکی ثابت کر رہا ہے اور دوسرا فریق انہیں انہی کے کلام اور تحریرات سے اشتراکیت کا دشمن بتا رہا ہے۔ اربابِ دانش مرحوم کو اس طرح رگید رہے ہیں اور عوام انگشت بدنداں ہیں کہ یہ ہمارا کس قسم کا حکیم الامت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

جنابِ شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

حضرت علامہ کا جو احترام ہمارے دل میں اور ان کا جو مقام دنیائے علم و فکر میں ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم حقیقتِ حال کو سامنے لاکر انہیں کم از کم اس الزام سے بچالیں کہ وہ اس قدر اہم موضوع پر ایسے متضاد خیالات کے حامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبالؒ چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض مقامات پر تضاد بھی پایا جاتا ہے اور بعض نکات کے متعلق ہمیں ان کے فہمِ قرآن سے بھی اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے مطالعۂ اقبال کی رو سے مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق ان کے ہاں تضاد نہیں اور وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ ہمارے نزدیک قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔

واضح رہے کہ ہم اس موضوع پر اس لئے قلم نہیں اٹھا رہے کہ اگر ثابت ہو جائے کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے حامی اور مؤید تھے تو ہم کہہ دیں کہ اشتراکیت عین مطابقِ اسلام ہے۔ اور اگر ایسا ثابت نہ ہو تو کہہ دیا جائے کہ اسلام اشتراکیت کے خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک کسی نظریہ یا مسلک کے اسلام کے مطابق یا مخالف ہونے کی سند اور حجت خدا کی کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ہے نہ کہ کسی فرد کا قول یا خیال۔ حتیٰ کہ ہم کسی شخص کے فہمِ قرآن کو بھی قرآنی سند اور حجت کا مقام نہیں دے سکتے۔

ہم نے جب اس بحث پر غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس مجادلہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں "اسلام" کا کوئی متعین مفہوم نہیں --- ہر فرد کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے حتیٰ کہ ایک ہی شخص

کا مختلف اوقات میں اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے کبھی، زمین پر بے حد و نہایت ذاتی ملکیت " عین اسلام ہے اور کبھی" دو سو ایکڑ رقبہ کی تحدید" عین دین ـــ اسی طرح اشتراکیت کا بھی کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں لایا جا رہا۔ اور ارباب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کسی اصطلاح کا مفہوم متعین نہ رہے تو اس کا نتیجہ الحاد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی لفظ یا اصطلاح کا مفہوم متعین کیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جائے گا۔ لہٰذا مسئلہ زیر نظر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اشتراکیت کا مفہوم متعین کیا جائے۔ واضح رہے کہ "اشتراکیت" سے ہماری مراد وہ سوشلزم ہے جس کا تصور مارکس نے دیا تھا۔

کارل مارکس محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا۔ اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفہ حیات کی رو سے، انسان کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصور حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ نبوت کا تصور باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیات اُخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیر نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفہ حیات کا ملخص۔

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مارکس کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) نظام سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا۔

(۲) اس جدید نظام میں، ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت نہ بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے۔

(۳) فاضلہ دولت، جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کسی کے پاس نہیں رہے گی۔

(۴) جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر دوسروں کی محنت کو غصب کر کے مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جا سکیں گی ـــ نہ افرادی کارخانے لگائے جا سکیں گے، نہ سود کا کاروبار ہو سکیگا۔ نہ یہ صورت پیدا ہو سکیگی کہ

اُفتد ہر اُفتد دیگر چیدہ

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفہ حیات

کا کبھی موید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہے۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعین رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام خلافِ اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآنِ کریم کو حرفِ آخر قرار دے دیا جائے تو اس حقیقت کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔

آئیے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

---(o)---

اقبالؒ کا قلبِ درد آگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک درد آگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کی چشمِ گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثری) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ

کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کیطرح مٹ جائے؟

یہ ۱۸۹۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے۔ یہ سوالات کہ (۱) آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے۔ اور (۲) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چھپ چھپ کر راہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ — ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے مروجہ مذہب کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظم عالم کے لئے مفلسی ایک جزو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولتمند لوگ صدقہ و خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے؛ اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پا لیا۔ اور انہی جوابات کو امت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے یہ جواب ملا

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب 'نظامِ سرمایہ داری' ہے۔ اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ان کا علاج، اس نظام کو الٹ دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم 'خضرِ راہ' میں — جو ۱۹۲۲ء (؟) میں کہی گئی تھی — خضرؑ سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضرؑ کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں ان کا فارسی مجموعہ کلام 'پیامِ مشرق' شائع ہوا۔ اس کے آخری باب 'نقشِ فرنگ' کا بیشتر حصہ 'محنت اور سرمایہ' کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ وہ اس میں 'صحبتِ رفتگاں' کے عنوان کے تحت ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں:

دارو‌ئے بیہوشی است تاج، کلیسا، وطن
جانِ خدا داد را خواجہ بجائے خرید

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ

راز دانِ جزو کل، از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری، قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفہ اضداد کو "عقلِ دورو" کی آفرینش کی تخلیق قرار دے کر اس پر ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ

درسِ رضا می دہد بندۂ مزدور را[1]

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی 'مزدک' دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ

وائے ایراں رفت زدستِ زار و قیصر بردمید　　مرگِ نو می زاید اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل　　تا تہی گردد حریمِ از خداوندانِ پیر

دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را زخسرو باز گیر

اس کے ساتھ ہی 'مزدوروں کا نمائندہ' 'کوہکن' اس نعرۂ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است　　ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم　　زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد　　ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

---

[1] انسانوں کا خود ساختہ مذہب 'غریب' کو تقدیر خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفہ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تقسیم کو عین مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے۔

فریبی بحکمت مرا اے کلیم — کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ — مرا خوئے تسلیم فرمودۂ
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویزِ پرکار و نا بردہ رنج
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچ کار است دزد

بہ جرمِ او پوزش آوردۂ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ؟

ازاں بعد "سرمایہ دار اور مزدور کا قسمت نامہ" ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے "سرمایہ دار" مزدور سے کہتا ہے کہ میاں، اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج برو می نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور پھر مزدور کی یہ دلخراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے۔

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوشِ محنت کش — نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی — ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں ز گریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا ردِ عمل —

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز ۔۔۔ مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم ۔۔۔ بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم ۔۔۔ بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

یہی حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہے جسے "زبورِ عجم" میں ان الفاظ میں وجۂ تزلزلِ قصرِ سرمایہ داری بتایا گیا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ۔۔۔ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب
انقلاب، اے انقلاب

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خلاقِ کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے ۔۔۔ بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل برد　　　نازمی آرد نیاز از دل برد
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام　　　نم بچشم منعماں کم دیدہ ام
(جاویدنامہ)

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی اشتراکی (ہی نے نہیں بلکہ کسی کمیونسٹ) نے اس سے زیادہ تند و تیز الفاظ میں، نظامِ سرمایہ داری کو اُلٹنے کے لئے دعوتِ انقلاب دی ہے؟ بالِ جبریل میں لینن خدا کے حضور یہ شکایت کرتا دکھائی دیتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں　　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ　　　دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور اس کا جواب چار ہی قدم آگے چل کر ہمیں اقبالؔ کے الفاظ میں یہ ملتا ہے کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　　تماشہ دکھا کر مداری گیا

جاوید نامہ میں مسلمان کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جی رمگ اندر پئے ایں دیر میر
سودخوار و والی و ملّا و پیر

دوسری جگہ ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　　اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

ملّا و پیر، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؔ اسے ابلیس کا پیدا کردہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور دورِ حاضر کے علم و فلسفہ اور تجارت و سیاست کو ملوکیت کی دسیسہ کاریوں کی تخلیق۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد　　　(ارمغانِ حجاز)

مثبت نظامِ معیشت

اقبالؒ اسطرح نظامِ سرمایہ داری کے بت سامری کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگے بڑھتے ہیں اور قرآنی نظامِ معیشت کی بنیادی شقوں کو سامنے لاتے ہیں نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی نظریۂ معیشت کی یکسر نقیض ہے اور ابلیسانہ فکر کی ایجاد۔ ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آرا ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں' ان میں ایک ستون یہ ہے کہ

ارض ملکِ خداست

اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت　　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر　　　رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نبیند کافر است

ہم نہیں سمجھتے کہ اقبالؒ اس مسئلہ کے متعلق' اس سے واضح تر الفاظ میں' اور کیا کہہ سکتا تھا۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ وہ مسئلہ ملکیتِ زمین کو 'کفر و ایمان' کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت قرار دینا کفر ہے۔

آگے چل کر کہتے ہیں۔

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　　ایں "متاع" بندہ و ملکِ خداست

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

ایکہ می گوئی متاعِ ما زماست　　　مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی' بگو　　　چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد　　　من زابلیسی ندیدم جز فساد

بردہٴ چیزے کہ از آنِ تو نیست!
دائم از کارے کہ شایانِ تو نیست!

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ۔

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ　　تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے

الارض للہ!

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) خاطب کر کے کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں۔ تیری نہیں میری نہیں

جب یہ زمین، تیرے آباء کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پاکر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری، تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے۔ اور قرآن کی رُو سے، جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی۔ جیسے اس نے جب کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اسے للناس بنایا گیا ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے۔ اسلئے وہ سواء ن العاکف والباد ہے۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا۔ یہی حیثیت زمین کی ہے، وہ نوعِ انسانی کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

فاضلہ دولت

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت رفاہِ عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے سب کی سب۔ اس فیصلے نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآنِ کریم کے اسی

فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ قرآن نے

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہ ژرف بین و دوررس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجہ شادابی عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور! فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العَفوْ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہو گی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہو گا، اسے اقبالؒ نے، جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر شہر مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس میں

سنت کش دہقاں چراغش روشن است از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آب جوست حاصلش بے شرکتِ غیرے از اوست

اور۔

نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش نے صداہائے گدایاں در دو گوش

اقبالؒ اپنی ۱۹۳۰ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

(۰)

اقبالؔ نے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا اس میں اور اشتراکیت (بلکہ اسکی آخری شکل کمیونزم) کے معاشی نظام میں کچھ بھی فرق ہے؟ جو حضرات اقبالؔ کو اشتراکیت کے معاشی نظام کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں چیلنج دیتے ہیں کہ وہ اقبالؔ کے کلام سے ایک مصرعہ ایسا نکال دکھائیں جس میں اُس نے اس نظام کے خلاف کچھ کہا ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپکے سامنے آچکی ہے۔ اقبالؔ کو یقین تھا کہ جس معاشی نظام کو اس نے قرآن سے سمجھا ہے وہ عہدِ رسالتمآب میں عملاً متشکل ہو گیا تھا اور چونکہ وہ نظام اشتراکیت کے مماثل تھا، اس لئے ابوجہلؔ کو یہ مغالطہ لگ رہا تھا کہ

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی ست
خوب می دانم کہ سلمانؔ مزدکی ست

(٭)

۲- اشتراکیت کی مخالفت

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اقبالؔ اشتراکی نظامِ معیشت کا پورا پورا حامی تھا کیونکہ وہ نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اقبالؔ اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا نو حامی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ فلسفہ قرآن کے فلسفۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ لہذا اُس نے اس فلسفہ حیات کی تردید اور مخالفت کی اور سخت مخالفت کی۔ اس فلسفہ کی بنیاد "انکار" پر ہے جسے اقبالؔ لَا سے تعبیر کرتا ہے۔ — خدا کا انکار، وحی کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، اُخروی حیات کا انکار — اقبالؔ نے اس فلسفہ پر تنقید کی اور کہا کہ اس پر متفرع نظامِ زندگی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ وہ اپنی مثنوی — پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق — میں لکھتے ہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں۔ لا کلیسا۔ لا اِلٰہ!

لا سلاطیں! اور لا کلیسا تک تو بات درست ہے کہ یہ نظامِ سرمایہ داری کے کل پُرزے ہیں۔ لیکن لَا اِلٰہ کے بعد اِلّا اللہ نہایت ضروری ہے۔ اسلئے کہ

در مقامِ لَا نیاساید حیات	سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لَا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں	نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

وہ جاوید نامہ میں ملّتِ روسیہ کو حسبِ ذیل پیغام دیتے ہیں۔

نو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہٴ کارِ خداونداں تمام　　بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندہٴ　　تا رہِ اثبات گیری زندہٴ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہٴ اُو را اساسِ محکمے

یہ اساسِ محکم اسے کہاں سے ملیگی؟ — کہتے ہیں۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از امّ الکتاب

———— (۰) ————

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ اشتراکیت کے معاشی نظام کی تو حمایت کرتا ہے لیکن اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ جو کارل مارکس کی یہی دو حیثیتیں ہیں جنہیں وہ بڑے بلیغ اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کہتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

یعنی وہ پیامبرِ انقلاب تو ہے لیکن وحی کی راہ نمائی سے محروم ہے۔ اس کا انقلابی پروگرام (جو نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم کرنے کا داعی ہے جو قرآنی نظام کے مماثل ہے) برحق ہے لیکن اس کا فلسفۂ زندگی یکسر باطل ہے

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است　　قلبِ او مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ! اس کا قلب دردآگیں مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مصائب سے وقفِ اضطراب ہے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے ایسا انسانیت ساز نظام تجویز کرتا ہے۔ اسلئے اس کا قلب مومن ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ یکسر باطل ہے اسلئے "دماغش کافر است" — اس مقام پر مارکس کو "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہا گیا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں مشیرِ ابلیس کی زبان سے اس کے متعلق کہلوایا ہے کہ

وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

یعنی ایک عظیم داعیٔ انقلاب، جو وحی کی روشنی سے محروم ہے۔ مارکس (یا اشتراکیت) کی اس محرومی، اور

بے بصری پر اقبالؔ کا دل کڑھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وحی کی اساس محکم نہ ہونے کی وجہ سے، اس قدر عظیم انقلاب انسانیت، ناکام رہ جائیگا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ اس انقلاب کے داعی اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب ابد درکنار ہوجائے۔ اس امتزاج سے یہ عین مطابق اسلام ہوجائے گا۔ جب اقبالؔ نے ینگ ہسبنڈ کو لکھا تھا کہ

بالشوزم + خدا = اسلام

تو اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو اگر قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرلیا جائے تو یہ اسلام کے مماثل ہوجائے گا۔ اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات کا راز وابستہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ!

—(۰)—

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، اقبالؔ یقیناً اشتراکی ہے کیونکہ وہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا قائل ہے جو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ اور

(۲) جہاں تک اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا تعلق ہے، اقبالؔ ہرگز اشتراکی نہیں کیونکہ وہ اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا مخالف ہے جو قرآن کے پیش کردہ فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔

اور یہی اس بحث کا ماحصل ہے۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار کی صبح — آٹھ بجے

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ (۲)۔ لاہور

کراچی میں

ہر اتوار کی صبح — ۹ بجے — بذریعہ ٹیپ

سیمینار ہال۔ سندھ اسمبلی بلڈنگ

ڈھاکہ میں

ہر اتوار۔ سہ پہر۔ ۴½ بجے — بذریعہ ٹیپ

مکان نمبر ۱۱۳ — رقیہ سلطانہ روڈ۔

رابطہ کے لئے ٹیلیفون ۲۶۶ / ۲۴

کوئٹہ میں

ہر جمعہ — سہ پہر — بذریعہ ٹیپ

المیزان بلڈنگ۔ کمرہ ۱۱

نقد و نظر

ربِّ اکبر (اردو) از ۔ محمد حنیف رامے، ناشر ۔ البیان، چوک انارکلی ۔ لاہور
ضخامت ۔ ۲۰۰ صفحات، ٹائپ ۔ کاغذ سفید ۔ قیمت ۔ پانچ روپے۔

زیرِ نظر کتاب محمد حنیف رامے صاحب کے آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے کوئٹہ کی گوشہ نشینی میں "اکتساب" پر غور و فکر کے بعد لکھے۔ موضوعات کے اعتبار سے کتاب تین ابواب' دین' فن اور سیاست پر مشتمل ہے۔ رامے صاحب ہمارے ملک کے سنجیدہ فکر نوجوان طبقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ایک سیاسی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں جس کے نصب العین میں "دین" کا لفظ بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن اس کے بعد رامے صاحب کی یہ حیرت کچھ ناقابلِ فہم سی دکھائی دیتی ہے کہ

"میری دین اور فن سے گہری دوستی "سیاسی مخلوق" کے لئے انوکھی اور تعجب خیز ہوگی"!

فکرِ اقبالؒ ہماری پاکستانی تہذیب کا منبع ہے' ہمارے اسلام دوست دانشور طبقہ کے نظریاتی زاویے کسی نہ کسی انداز سے اقبالؒ کے نظامِ افکار سے ترتیب پاتے ہیں' رامے صاحب کے یہ مضامین بھی اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور وہ علامہ اقبالؒ کے فکری سانچوں کو اپنے مزاج کی رنگت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ موضوعات کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ اندازِ تحریر کی شگفتگی رامے صاحب کی ذاتی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

ہمارے دور کی نظریاتی شکست و ریخت میں کئی ایک غلط اور صحیح فکر کے حامل حضرات سرگرمِ عمل ہیں؛ رامے صاحب اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"مسلمانوں کی خودی کو جسے عمرؓ جیسے معماروں نے خونِ جگر سے پالا تھا' ان معماروں کے مقلدوں نے ناکارہ کر دیا۔ اس ناکارہ خودی کا اب صرف ایک اور ایک علاج ہے کہ مسلمان خدا کے مرتب و مقدر کئے ہوئے قانون ہی کو اساسِ حیات بنائیں۔"

اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کے تہذیبی ٹکراؤ میں سرسیدؒ اور اقبالؒ ہی کے افکار ایسے ہیں جو خلقِ جدید کو نئی زندگی سے بھاگنے کے بجائے' اس کے قریب آنے کی دعوت اور "خدا کے قانون" کو اساسِ حیات بنانے کی ترغیب دیتے ہیں؛ رامے صاحب اقبالؒ کے بعد اس مشن کی رفتار کو جامد محسوس کرتے ہیں — ہمارے

خیال میں سرسید اور اقبال کے بعد قرآن کو اساسِ حیات بنانے کی تہذیبی تگ و تاز میں کئی ایک شخصیتیں مصروفِ عمل ہیں جن کا تذکرہ رائے صاحب نے (شاید) مصلحتاً نہیں کیا ۔ اسلئے کتاب کا پہلا باب مواد کے اعتبار سے نامکمل اور تشنہ رہتا ہے ۔

فن کے بارے میں رائے صاحب کے تین مضامین قاری کو ابتدائی معلومات فراہم کرتے ہیں ۔ فن کی معنویت سے مسلمانوں کے گریز پر سنجیدہ تنقید اور فنکارانہ تجزیہ کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کی افادیت پر جس انداز سے زور دیا گیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے ۔

ہمارے ملک کی سیاست کے المیے کے بارے میں رائے صاحب کی رائے ہے کہ آج اسلام ایک مبہم اصطلاح ہے اور ہر مسلمان کا اسلام الگ الگ ہے ۔ انکے نزدیک اس المیے اور خوفناک صورتِ حال کا حل " قرآن " کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ اس نتیجہ تک پہنچنے پر ہم رائے صاحب کو درخورِ تبریک و تحسین سمجھتے ہیں ۔

کتاب کا آخری مقالہ کچھ اخباری نوعیت کا ہے اور کتاب کے دوسرے سنجیدہ اور فکری مباحث میں کچھ اَن جوڑ سا محسوس ہوتا ہے اور قاری کے آخری تاثر پر کچھ اچھا نقش نہیں چھوڑتا ۔ شاید یہ گوشہ نشینی کو ترک کے بعد کا اضافہ ہے ۔

بہرحال رائے صاحب کے یہ مضامین پاکستان اور اسلام کی بارگاہ میں اُن کے حساس دل کے جذبہ اور جوش کی عکاسی کرتے ہیں اور پاکستانی نوجوانوں کے قلب و نظر کی تطہیر میں کافی حد تک مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں ۔

(غلام صابر)

تصحیح

طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۶۹ء میں "جماعتِ اسلامی اور علماء" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے ، اسکے صفحہ ۵۹ پر حسبِ ذیل دو حوالے یوں ہونے چاہئیں ۔

(۱) ۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۱-۱۴۲) کی جگہ (تعلیمات صفحہ ۱۴۲-۱۴۷)

(۲) ۔ ترجمان القرآن بابت جولائی تا ستمبر کے بعد (۱۹۵۵ء) کا اضافہ کر لیا جائے ۔

شاہد عادل

المیہ فلسطین اور جماعت اسلامی

جون ۱۹۶۷ء میں ہمارے عرب بھائیوں کو جو روزِ بد دیکھنا پڑا، وہ ان مصائب کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اہلِ فلسطین کو پچھلے تیس چالیس سال سے برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ بلکہ اگر ان پچھلے تیس چالیس کے مظالمِ یہود کو سامنے رکھا جائے تو اس المیہ کی حیثیت ان کے مقابلہ میں کچھ کمتر ہی نظر آئے گی۔ اس حقیقت سے تو ساری دنیا واقف ہے کہ یہود کو ان انسانیت سوز اور ننگِ آدمیت جرائم کی جرأت اس وجہ سے ہوئی کہ استعماری طاقتیں ان کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ اس لئے اس بارے میں کوئی دلائل دینا ہم تحصیلِ حاصل سمجھتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین کی ابتداء

اس مسئلہ کی ابتداء درحقیقت اس وقت ہوگئی تھی جب فلسطین کی سرزمین پر پہلے پہل یہودیوں نے ناجائز طور پر قدم رکھا تھا۔ تاہم پچھلی صدی کے آخر تک ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ اس صدی کے شروع میں ان لوگوں نے بڑی تعداد میں جائز و ناجائز طریقے سے فلسطین میں داخل ہو کر آباد ہونا شروع کیا۔ لیکن چونکہ یہ ایک بڑی عیار قوم تھی اس لئے انہوں نے شروع شروع میں صرف ان بنجر علاقوں کا رخ کیا جنہیں عرب چھوڑ سکتے تھے تاکہ ان کی ناجائز دخل اندازی سے کوئی متوحش نہ ہونے پائے۔ انہوں نے اُن بنجر زمینوں کو اس محنت سے آباد کیا کہ وہ سرسبز لہلہاتے کھیت بن گئے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی علیحدہ بستیاں بھی بسائیں۔ یہ عمل جاری رہا۔ اور اس طرح ۱۹۱۴ء تک یہود کے قبضے میں فلسطین کا ۱۷۷ مربع میل رقبہ آگیا۔ ۱۹۳۶ء تک پہنچتے پہنچتے وہ ۵۴۵ مربع میل پر قابض ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی توجہات اور سعی و کاوش کو زراعت تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے اہم مراکز میں اپنی صنعتیں بھی قائم کر لیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۳ء تک اکیلے فلسطین میں ان کے چار ہزار کارخانے کام کر رہے تھے۔

اسی دوران انہوں نے بڑے بڑے تعلیمی ادارے بھی قائم کئے۔ حیفہ کا ٹیکنیکل کالج سارے مشرقِ وسطیٰ

کیا۔ ایشیا بھر میں انجنیئرنگ کا بیت بڑا ادارہ ہے۔ یروشلم میں عبرانی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے مقابلے میں عرب ممالک بنیادی تعلیم تک کی سہولتوں سے محروم تھے۔ اس طرح جب انہوں نے زور پکڑنا شروع کیا تو عربوں نے ان کی گرفت کو محسوس کیا۔ جب اس گرفت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے۔ لیکن اس وقت تک یہود اقلیت میں ہونے کے باوجود کافی طاقتور ہو چکے تھے۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان پہلا فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا جس کی فوری وجہ اسرائیلیوں کی زیر زمین سرگرمیاں تھیں۔ آئے دن سرکردہ عرب پراسرار طریقے سے قتل ہو رہے تھے۔ عربوں کو ایک تو بالفور اعلان نے دوسرے "وعدہ زمین" یا میر فیصل معاہدے[1] نے جھنجھوڑا اور وہ کسی حد تک بیدار ہوگئے۔ اس پہلے فساد میں پانچ صیہونی مارے گئے اور تقریباً دو سو زخمی ہوئے[2]۔

مصائب کا دور

اس فساد کے بعد عربوں پر مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف یہود کے مظالم تھے اور دوسری طرف قوم لیڈرشپ سے محروم تھی۔ بلکہ عربوں کا جو لیڈر بھی یہود کے خلاف آواز اٹھاتا تھا اُسے فوراً پُراسرار طریقے سے ختم کر دیا جاتا تھا۔ یہ الم انگیز اور عبرت آمیز داستان بڑی طویل ہے اس لئے ہم اس کی تفاصیل سے اجتناب کرتے ہوئے یہود کے مظالم کا مختصر سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"یہود کے ان مظالم کی وجہ سے پندرہ ہزار عرب جان بحق ہوگئے تیس ہزار زخمی ہوئے اور چونکہ حکومت برطانیہ ان کی پشت پر تھی۔ اس لئے الٹا ایک لاکھ عربوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا۔"[3]

خیال رہے کہ یہ مصائب ۱۹۴۸ء سے قبل کے ہیں اور موجودہ المیہ کی روشنی میں ان کی حیثیت اور شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فلسطین جلتا رہا اور صالح لوگ خاموش تھے

اس طرح فلسطین کو جلتا دیکھ کر تمام دنیا کے مسلمان خون کے آنسو روتے تھے اور وہ مختلف طریقوں سے اپنی ہمدردیوں کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن برصغیر ہندو پاک میں کچھ ایسے "صالح لوگوں" کی جماعت بھی تھی جنہوں نے اس طویل عرصہ میں فلسطین کو جلتا دیکھا لیکن بالکل خاموش رہے۔ عامۃ الناس کو ان صالح

---

[1] یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس وقت کے عرب حکمران ترک دشمنی میں یہودیوں کے خطرناک عزائم تک سے غافل ہوگئے۔ ط

[2] "محشر فلسطین" - از میجر جنرل محمد اکبر خان۔ صفحہ ۱۲۲

[3] "مسئلہ مشرق وسطیٰ" از غلام محمد صفحہ ۱۲۳ - (THE MIDDLE EAST - CRISIS) - آئندہ حوالہ میں اردو نام دیا جائے گا۔

لوگوں کی یہ خاموشی کچھ عجیب سی لگی اور مختلف حلقوں کی طرف سے اس کی وجہ دریافت کی جانے لگی۔ اس سلسلہ میں ایک سوال اور ان کی طرف سے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے جو ان کی خاموشی کے راز کا غماز ہے۔

سوال:- بعض اصحاب پوچھتے ہیں کہ فلسطین کی سیاست میں امریکہ اور برطانیہ کی خود غرضی و اسلام دشمنی کے نتائج آشکار ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس معاملہ میں کبھی اپنی پالیسی کا اظہار کیوں نہ کیا؟

جواب:- ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکہ سخت ظلم کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے معاملے میں انہوں نے حد کر دی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین یا ہندوستان یا ایران یا ٹرکی کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کشمکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اس مسئلہ پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہوگا، دوسرے مسائل کے حل ہو جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔[1]

اس طرح فلسطین جلتا رہا اور یہ حضرات خاموش تماشائیوں کی طرح اُسے دیکھتے رہے کیونکہ یہ ان کے نزدیک

المیہ فلسطین اور اس کے حل کی طرف پہلا قدم

کوئی مسئلہ ہی نہ تھا اور بالفرض یہ اگر حل بھی ہو جاتا تو ان کے نزدیک لاحاصل تھا۔ یہاں تک کہ جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو ایسا زبردست دھچکا لگا جس نے ان کے ہوش اُڑا دیئے اور ہوش بحال کر دیئے اور انہوں نے پہلی دفعہ اس مسئلہ کے حل کے لئے صحیح قدم اٹھایا۔ یہ صحیح قدم بڑے وسیع پیمانے پر اسرائیل کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز ہے۔ اس اقدام کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اسرائیل کا فوجی غرور توڑ دیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو ایک طاقتور مقابل کے سامنے محصور پایا ہے۔ یہ گوریلا لڑائی اس کامیابی سے لڑی جا رہی ہے کہ ابھی تک اسرائیل ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا اور بدحواس ہو کر عربوں کے شہری ٹھکانوں پر ہوائی حملے کر رہا ہے۔ اسی گوریلا کارروائیوں کی کامیابی کی وجہ سے بڑی طاقتوں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ ماہرین سیاست کا خیال ہے کہ اگر عرب یہودیوں کی کسی اور خطرناک عیاری کا شکار نہ ہو گئے تو وہ یقیناً اسی طریقہ سے فتح حاصل کر لیں گے۔

وقتی مسئلہ اصلی مسئلہ بن گیا

اہل فلسطین کے اس جرأت مندانہ اقدام کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ یکایک یہ "وقتی مسئلہ" "اصلی مسئلہ" بن گیا اور وہ حضرات جو بیس چالیس سال سے خاموش تماشائی تھے بڑی تیزی سے میدان میں آ گئے کہ انہوں نے اپنے اصلی کام کو چھوڑ کر اس وقتی مسئلہ

---

[1] ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۴۸ء، و رسائل و مسائل حصہ اول، صفحہ نمبر ۵۲

کے بارے میں دو سال کے قلیل عرصے میں کوئی ایک درجن کتابیں شائع کر دیں۔ ہمارا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ ان حضرات نے کسی موضوع پر اتنے قلیل عرصہ میں اس تیزی سے اتنی کتابیں ابھی تک شائع نہیں کیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جماعت کے موقف اور عمل میں اس قدر تبدیلی یونہی بے مقصد اور بے مطلب ہے یا اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد کام کر رہا ہے؟ آیئے ہم ذرا اس کی گہرائی میں جا کر دیکھیں کہ اس یکایک اضطراب کا جذبہ محرکہ اور منتہیٰ کیا ہے۔

پہلی کتاب اور شک کی بنیاد

یہ ایک اہم انگیز حقیقت ہے کہ جن دنوں ان حضرات کی طرف سے اس مسئلہ پر پہلی انگریزی کتاب "یہودی سازشیں اور عالم اسلام" شائع ہوئی ٹھیک انہی دنوں اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا۔ اس کتاب کے شائع کرانے میں کچھ ایسے اقدامات کئے گئے جن سے لوگوں کے دلوں میں خواہ مخواہ شکوک ابھرنے لگے۔ آپ بھی ان شکوک پیدا کرنے والے اقدامات پر ایک نظر ڈالیے۔

(۱) اس کتاب کے اشتہارات ماہ نامہ "چراغِ راہ" میں علیحدہ بیٹوں کی صورت میں دیئے گئے تھے حالانکہ مصنفِ کتاب چراغِ راہ کے نہ صرف ایڈیٹر تھے بلکہ اس کے ہمہ وقتی کارکنوں میں سے تھے۔ اس کے باوجود یہ احتیاط کہ اشتہار "چراغِ راہ" کے صفحات پر نہ ہو آخر بغیر کسی وجہ کے تو نہیں تھا۔

(۲) ان حضرات کی طرف سے کسی کتاب کے بارے میں یہ پہلی دفعہ اعلان تھا کہ اس کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ ہمارے لئے یہ امر بھی موجب حیرت بنا۔ کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق کتاب کے مصنف جب جماعت اسلامی کے پبلسٹی سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے تو بھی بلا معاوضہ کام نہیں کرتے تھے۔ خود جماعت اسلامی نے علمی کتابیں تو کجا، خالص تبلیغی کتابوں کو اس طرح شائع ہونے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اس وقت مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جو برصغیر میں سستا اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے ایڈیٹر "رسالہ مولوی" کے ساتھ پیش آیا جب اس نے جماعت اسلامی والوں کی ایک کتاب تبلیغی مقاصد کے لئے مفت اور سستے داموں فروخت کرنے کے لئے شائع کی۔ اس بیچارے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ خود انہی کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"دینیات اور خطبات۔ یہ بچوں اور بڑوں کو اسلام سے روشناس کرانے کے لئے اردو زبان کی بہترین کتابیں ہیں۔ "مولوی" میں متعدد بار نقل کر چکا ہوں۔ کتابی صورت میں دینیات ایک بار چھاپی تو بھارت کی جماعت اسلامی مزاحم ہوئی۔ حالانکہ یہ کام اس کا تھا مگر وہ تبلیغ سے زیادہ روپیہ کی فکر مند ہے۔ میں نے دینیات مجلد اسٹینڈ کا غذ صرف دس آنے میں بیچی۔ جماعت اسلامی ڈھائی روپے میں فروخت کرتی ہے۔ خطبات بھی مجلد تو بارہ آنے میں بیچا۔ وہ تین روپے میں فروخت کرتی ہے۔ میں مقدمہ بازی سے بچا اور جگ ہنسائی ذہونے

دی کہ میرا مقصد تبلیغِ اسلام تھا، تصادم نہ تھا۔ ایک ہزار کتابیں میں نے جماعت کو مفت دے دیں کہ وہ مفت تقسیم کر دے۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ یہ ہے ہماری جماعتوں کا حال۔" ؎

(۳) اس کتاب کا عنوان اور اس کے بارے میں تاثر یہ دیا گیا کہ یہ کوئی بہت بڑی سازش کا انکشاف ہے۔ لیکن اس کے نفسِ مضمون میں عنوان سے زیادہ اہم ایک اور چیز تھی۔ اور وہ تھی عرب ملک کے ایک سربراہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا۔

(۴) اس کتاب میں شائع ہونے والے پروٹوکولز (PROTOCOLS) کے متعلق مصنف نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ اسلامی دنیا کو ان سے پہلی بار متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ چیز یکسر غلط بیانی پر مبنی تھی۔ پروٹوکولز کے انگریزی زبان کے سینکڑوں ایڈیشنوں کا تو ذکر ہی کیا، صرف عربی زبان میں اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس میں فلسطین کے مفتی اعظم جناب امین الحسینی نے اس کے حوالے سے یہودیوں کے ان عزائم کو ہمارے سامنے بڑی تفصیل سے بے نقاب کیا تھا۔ بعد میں یہ تقریر پاکستان کے عربی رسالے "البشیر" کے، اس کانفرنس کی بابت خصوصی نمبر میں شائع ہوئی تھی۔

(۵) بجائے اس کے کہ کتاب پڑھنے والے از خود کسی نتیجہ پر پہنچیں، مصنف نے دیباچہ کتاب کے پہلے ہی پیراگراف میں، عرب ملک کے متذکرۃ الصدر سربراہ کو فرعون کا بیسویں صدی کا جانشین قرار دے دیا۔ حقائق اور دلائل سے پہلے ہی اپنا فیصلہ ٹھونس دینا پرزبردستی ٹھونسنا، صرف پروپیگنڈے کے لئے ہوتا ہے۔ کتاب کے اندر "فرعون" اور "فرعونیت" کے الفاظ کی جو گردان کی گئی تھی، اس سے پاکستان کا ہر باہوش فرد پکار اٹھا تھا۔ اس کی وجہ سے حکومت کو مجبوراً اس کتاب پر پابندی عاید کرنی پڑی۔

عرب ہمارے دینی بھائی ہیں

عرب ممالک ہمارے دینی بھائی ہیں اور وہ اپنی سیاست کو یقیناً ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کے اندرونی سیاسی معاملات میں دخل دینا جہاں ان کی ناراضگی کا باعث ہو سکتا ہے وہاں وہ ہمارے لئے بھی خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں اس وقت عیارانہ پروپیگنڈے کا چلن ہے اور سادہ لوح مسلمان بیچارے ہر جگہ اسی سے مار کھا رہے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی تشبیہ کے مطابق، مسلمانوں کا مزاج طفلانہ ہے اور دنیا کی عیار قومیں شکر پارہ فروش ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے دشمن ہندوستان نے اسی عیارانہ پروپیگنڈے کے زور پر ہی تو ہمارے بعض بھائیوں کو ہم سے دور کر رکھا

؎ رسالہ مولوی دہلی۔ بابت ماہ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ

ہے۔ مذکورہ بالا کتاب اور ادارہ چراغ راہ کی ایک دوسری انگریزی کتاب THE MIDDLE EAST CRISIS (جس کے اقتباسات آگے آئیں گے) بیروت میں کافی تعداد میں تقسیم ہوئی ہیں۔ یہ وہاں سے یقیناً دوسرے عرب ممالک تک بھی پہنچیں گی۔ ہمارے دشمن اسے اپنے مبارانہ پروپیگنڈے کے لئے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں، قارئین اس کا اندازہ آخر میں لگا سکیں گے۔

پروپیگنڈے کا کمال آج کی دنیا میں پروپیگنڈے کے فن نے جو خطرناک اہمیت حاصل کر لی ہے اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ جماعت عوام تو ایک طرف، اکثر اہل علم حضرات کو بھی ہنوز اس کا اندازہ نہیں کہ جماعت اسلامی جس قدر اس فن کی ماہر ہے، شاید حکومتیں بھی اس مہارت میں اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اب دیکھئے کہ جماعت اسلامی نے کس طرح بظاہر اپنے آپ کو اس کتاب سے الگ رکھا، لیکن جونہی اس کتاب پر پابندی لگی، انہوں نے ذرہ سا وقت ضائع کئے بغیر اپنے ایک اور کم مشہور ادارہ فرینڈز پبلیکیشنز ملتان کی طرف سے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر دیا۔ لیکن اس میں اس طرح رد و بدل کیا گیا کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس سے 'فرعون اور فرعونیت' کے الفاظ اور ایک عرب ملک کے سربراہ پر امریکی سراغ رساں ادارے (سی۔ آئی۔ اے) کے ایجنٹ ہونے کا الزام قلمزد کر دیا گیا۔ اس نئی کتاب کا نام 'عالم اسلام اور یہودیت' رکھا گیا۔

اس کے ساتھ ہی، جماعت اسلامی کے ایک اور ادارہ 'چراغ راہ' کی طرف سے ایک انگریزی کتاب (THE MIDDLE EAST CRISIS) شائع کر دی گئی اور مذکورہ صدر اردو کتاب میں فرعونیت وغیرہ کے جو لفظ قلمزد کئے گئے تھے، وہ اس میں نئی آن کے ساتھ شامل کر دیئے گئے۔ بلکہ اس میں اس پہلی کتاب سے بھی زیادہ زہر آلود مواد درج کر دیا گیا۔ یہ کتاب بھی بیروت میں کافی تعداد میں دیکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف جناب غلام محمد صاحب امیر جماعت اسلامی کراچی ہیں۔ لیکن بڑی خوبصورتی سے ان کی اس حیثیت پر پردہ ڈال کر انہیں پاکستان کا ماہر امور مشرق وسطیٰ دکھایا گیا۔

اس سے بھی عجیب بات یہ کہ ان کے ادارہ اسلامک ریسرچ اکیڈمی، جس کا 'چراغ راہ' ترجمان ہے، کے متعلق بیروت میں یہ تاثر ہے کہ یہ کراچی یونیورسٹی ہی کا کوئی ادارہ ہے۔ دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس کے سیکریٹری جنرل کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

ایک درجن کتابیں غرضیکہ ان موضوع پر مختلف رنگوں میں، ان کی طرف سے کوئی ایک درجن کتابیں شائع کی گئی ہیں اور جو چیز انہیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ثابت کرتی ہے، وہ ان کا ایک ہی تھیم کا ہونا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ تمام کتابیں موجود ہیں۔ ان میں

مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔

فریقین کی جنگی طاقت

اس بارے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ تمام عرب ممالک تو ایک طرف صرف مصر کی جنگی طاقت اسرائیل سے کئی گنا بڑی تھی۔ اس کے باوجود جو انہوں نے شکست کھائی ہے تو اس کی وجہ اسلحہ کی کمی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ لکھا ہے۔

"اس میں کسی ادنیٰ شبہ کی بات نہیں کہ روس نے جو اسلحہ مصر کو دیا تھا وہ اسرائیل کے اسلحہ سے مقدار میں بھی زیادہ تھا اور صلاحیت میں بھی۔ اس کا ہوائی بیڑہ اسرائیل کے ہوائی بیڑے سے بڑا تھا۔ اس طرح سے مصر کی بحری طاقت تو اسرائیل سے کئی گنا زیادہ تھی[1]"

پاکستان میں میجر جنرل اکبر خان صاحب نے "معرکہ فلسطین" کے عنوان سے جو کتاب تصنیف اور شائع کی ہے اگر یہ ایک درجن کتابیں تصنیف کرنے والے حضرات اس ایک کتاب کا مطالعہ فرما لیتے تو ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔ بشرطیکہ وہ غلط فہمیاں بربنائے جہالت ہوتیں، دانستہ فریب دہی کی کوشش نہ ہوتی۔

عربوں کا نقطۂ نظر

یہ تو ہم پہلے بھی اشارۃً بتا چکے ہیں کہ فلسطین میں عربوں کی شکست کی وجہ یہودی عیاری تھی۔ میجر جنرل محمد اکبر خان نے بھی اپنی کتاب میں اسکے ثبوت میں بڑے وزنی دلائل دیئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسرائیل کی فوجی طاقت عربوں کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ تھی۔ بیچارے عرب اس تین گنا زاید جنگی طاقت کا رونا روتے رہے اور ہمارے صالح حضرات نے اس کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ (البتہ کراچی کے رسالہ ماہنامہ البلاغ کراچی کی ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کی اشاعت میں اس کا ذکر ہے۔ یہ رسالہ مفتی محمد شفیع صاحب کی زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے)۔ اسرائیل کی اس براہ راست جنگی طاقت کے علاوہ استعماری حکومتوں کی اس سے کئی گنا زاید طاقت عربوں کے اردگرد موجود تھی ـــ بلکہ اس کا کثیر حصہ خود عربوں کی سرزمین کے اندر تھا۔

غیر ملکی فوجی اڈے

جس عرب ملک کے سربراہ کے پیچھے یہ حضرات پنجے جھاڑ کر پڑے ہوئے ہیں مسئلہ فلسطین کے متعلق اس کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ جب تک عربوں کی سرزمین میں غیر ملکی فوجی اڈے موجود ہیں عرب فلسطین کی جنگ کبھی نہیں جیت سکتے۔ وہ سربراہ مملکت اس اصول کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ وہ اسے تمام دوسرے ممالک کے ساتھ (چاہے وہ عرب ممالک ہوں یا اسلامی

---

[1] ماہنامہ چراغ راہ کراچی۔ شرق اوسط نمبر صفحہ ۴۰

یا غیر اسلامی) تعلقات میں بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ ان حضرات نے اپنی درجن بھر کتابوں میں اس اہم وجہ کا نام تو درکنار کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ حالانکہ یہ حضرات بیروت تو اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ اگر وہاں کسی ٹیکسی ڈرائیور سے بھی عربوں کی ناکامی کے اسباب دریافت کریں تو وہ بھی اس امر کی طرف ضرور اشارہ کریگا۔

میجر جنرل محمد اکبر خان صاحب نے بھی اسے ایک بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہرچند کویت، سعودی عرب، لبنان، سوڈان، شام اور الجزائر نے عربی اتحاد اور اسرائیلیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، تاہم ان کی فوجیں حرکت میں نہ آسکیں۔ ان کے پاس کوئی ایسی تیز ٹرانسپورٹ ہی نہیں تھی۔ اس دشواری کے علاوہ ان میں سے کئی ممالک میں امریکی اور برطانوی فوجی مشن ابھی موجود تھے جیسے ابتدائے پاکستان میں بھی تھے۔ یہ مشن من مانی کرایا کرتے تھے۔ پاکستان میں ان کا کردار یہی رہا ہے۔ انہی غیر ملکی مشنوں کی وجہ سے برصغیر میں فرقہ وارانہ خون ریزی ہوئی اور انہی کی بدولت کشمیر کی جنگ ہوئی بھی اور رُکی بھی۔ میں اس غیر ملکی دخل اندازی اور اپنے ملک کی دفاعی کمزوری کا عینی شاہد ہوں"۔

"یہی فوجی مشن کئی مسلمان ممالک میں موجود تھے اور جنگی پالیسی کی باگ ڈور مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلمان ملکوں کی افواج کو بروقت حرکت نہ کرنے دی اور نہ فیصلہ ہی کرنے دیا کہ جنگ کی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان مشنوں کا ایک اور نقصان یہ ہوا کہ جن ملکوں میں وہ موجود تھے وہاں کی دفاعی پالیسی صیغہ راز میں رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ روز بروز واشنگٹن اور لندن کو پتہ چل رہا تھا کہ مسلمان ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس طرح اسرائیل بھی پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے برعکس عرب ممالک اسرائیل کی اندر کی باتوں سے بالکل بے خبر تھے"۔[۵]

آگے چل کر (اسی کتاب کے صفحہ ۶۶ پر) اسرائیلی فضائیہ کے کمانڈر انچیف کرنل ہڈ کی زبانی اس کا اعتراف نقل کیا گیا ہے کہ انہیں امریکہ کے سراغرساں ادارے کی مدد سے یہ راز حاصل ہوئے۔

شکست کا سبب الاخوان المسلمون کی زبانی

اس کے برعکس آپ یہ دیکھئے کہ ہمارے یہ صالح حضرات عربوں کی شکست کی وجہ کیا بیان کرتے ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ چراغِ راہ کے مشرقِ اوسط نمبر (بابت جون ۱۹۶۸ء) میں، اردن کے الاخوان المسلمون کے مراقب عام محمد عبدالرحمٰن خلیفہ کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے، وہ اس میں لکھتے ہیں۔

"یاد رکھیئے کہ یہ شکست ان لوگوں کو نہیں ہوئی جو اسلام کا پیغام لے کر اُٹھے تھے اور جنہوں نے

---

[۵] "معرکۂ فلسطین" شائع کردہ، مکتبۂ داستان۔ لاہور۔ صفحہ ۵۵، ۵۶

اسلام کو بحیثیت نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی قبول کیا تھا۔ یہ ان گمراہوں اور مرتدوں کی شکست ہے جو سرزمینِ عرب کے بعض حصوں پر اسلام دشمن اور بالفعل کافر حکومتوں کے تعاون سے قابض ہیں۔ یہ ان لادینی اور انقلابی نظریات کی شکست ہے جنہیں یہ مرتد اور گمراہ جدید عرب ذہن میں بٹھانا چاہتے تھے کہ جدید ذہن اس رنگ میں رنگ جائے۔"

خلیفہ صاحب کا یہ تمام مضمون اسی محور کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس سے چند سطریں قبل فرماتے ہیں:۔

"یہ شکست دراصل سائنٹیفک سوشلزم اور انقلابی نظریۂ حیات کی شکست ہے۔ اسی نظریہ نے اسرائیل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، کیونکہ عربوں کو افلاس اور تباہی سے دوچار کرنے کی ذمہ داری اسی پر عاید ہوتی ہے۔" ؎

الاخوان المسلمون کے مراقب عام کے ان ارشادات کو پڑھیئے۔ ان میں ہمدردی کے جذبات تو کجا، الٹا زیرِ لب استخفاف کی ہنسی کا اظہار ہو رہا ہے۔ کس قدر مقامِ تأسف ہے کہ دوست تو دوست، عربوں کے دشمنوں تک نے اس المیہ پر ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن وہاں کی دینی جماعت اس طرح نشتر چبھو رہی ہے۔

صالحین کے نزدیک شکست کے اسباب

اس طرح کی تمہید قائم کرنے کے بعد یہ حضرات عربوں کی شکست کے مختلف اسباب گناتے ہیں۔ جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل تین ہیں:۔

(۱) امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل کے اشارے پر الاخوان المسلمون کو کچلنا۔

(۲) عرب قومیت کی لعنت۔

(۳) عرب سوشلزم۔

الاخوان المسلمون اور المیہ فلسطین

ان ایک درجن کتابوں میں شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس میں انہوں نے کسی نہ کسی طرح الاخوان المسلمون پر صدر ناصر کے مظالم کا ذکر نہ کیا ہو۔ ان مظالم کے باربار تذکرے کی وجہ سے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ عربوں کی اس شکست کا باعث، اخوان المسلمون پر مبینہ مظالم تھے، اس کا تجزیہ سب سے پہلے کر لیا جائے۔

ان حضرات کے خیال کے مطابق ۱۹۴۸ء میں فلسطین کا جو علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں باقی رہا تھا، وہ الاخوان المسلمون کی قربانیوں کی بدولت تھا۔ لکھا ہے۔

؎ ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی۔ مشرقِ اوسط نمبر۔ جون ۱۹۶۸ء۔ صفحہ ۳۲۔

"اس جنگ میں حکومتوں کی فوجوں کے علاوہ فلسطین کے مجاہدین اور مصر اور شام کے الاخوان المسلمون نے حصہ لیا۔ اور درحقیقت فلسطین کا جو حصہ یہودیوں سے بچ سکا تھا وہ انہی مجاہدین کی بہادری اور قربانیوں کی بدولت بچا تھا"[۵۹]

لہٰذا ان حضرات کے خیال کے مطابق، استعماری طاقتوں نے سب سے پہلے، صدر ناصر کے ذریعے اس جماعت کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انگریزوں کے اشارے پر اسلام پسند حکمران "شاہ فاروق" کو تخت سے ہٹانے کی سازش کی گئی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"یہ ۱۹۵۱ء کا وسط تھا۔ اسلام دشمن طاقتوں نے اسی وقت شاہ فاروق کو ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ موزوں آدمی کی تلاش شروع ہو گئی۔ اب وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک تیر سے دو شکار کئے جائیں۔ یعنی مصر میں کوئی ایسا شخص برسرِ اقتدار لایا جائے جو ایک طرف مصر اور سوڈان کو متحد نہ ہونے دے اور دوسری طرف اخوان کی تحریک کچل کے رکھ دے۔ ان کی نظرِ انتخاب .... پر پڑی"[۶۰]

جس کتاب (یعنی عالمِ اسلام اور یہودیت) سے یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس کے متعلق قارئین سن چکے ہیں کہ یہ ضبط شدہ انگریزی کتاب کا اردو چربہ تھا۔ اس لئے اس میں احتیاطاً وہ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جس میں صدر ناصر کا نام تھا۔ (لیکن اسی مضمون میں بعد میں یہ احتیاط بھی ترک کر دی گئی)۔

استعماری طاقتیں اور الاخوان المسلمون

اس کے بعد لکھا ہے۔

"دسمبر ۱۹۵۴ء کے آخر میں برطانیہ، امریکہ، یہودیوں کے دباؤ کے تحت مصر کی نئی لیڈرشپ نے اخوان کو کچل ڈالا۔ کیونکہ یہ تینوں طاقتیں اس بات کو اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر اس مرتبہ یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو پھر عرب ممالک میں نہ صرف یہ کہ اسرائیل کا ناسور ختم ہو جائے گا بلکہ ان استعماری طاقتوں کا اثر و نفوذ بھی کلیتہً ختم ہو جائیگا"[۶۱]

یہ ہے جماعتِ اسلامی کے امورِ مشرقِ وسطیٰ کے ماہر چوہدری غلام محمد صاحب کی تحقیق انیق۔ اب دیکھئے حقائق اس کو کس طرح جھٹلاتے ہیں۔

جہادِ فلسطین اور ظالم حکومت کے تمغے

اس حقیقت سے ہمیں انکار نہیں کہ ۱۹۴۸ء کے جہاد

---

[۵۹] ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی - مشرقِ اوسط نمبر - جون ۱۹۶۰ء - صفحہ ۵۸

[۶۰] عالمِ اسلام اور یہودیت - مطبوعہ ملتان - صفحہ ۳۲ - ۳۳

[۶۱] "چراغِ راہ" مشرقِ اوسط نمبر - صفحہ ۴۶

فلسطین میں الاخوان المسلمون نے حصہ لیا لیکن جب یہ مجاہد واپس لوٹے تو ان کی جماعت پر حکومت مصر کی طرف سے مختلف قسم کے غیر انسانی مظالم ہو رہے تھے۔ جماعت کے بانی حسن البناء سر بازار شہید کئے جاچکے تھے لیکن اللہ کے ان شیروں نے جہاد فلسطین سے لوٹتے ہی اسی نظام حکومت سے تمغے حاصل کرنے کی درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ یہ تلخ حقیقت بھی خود انہی کی زبانی سنیئے۔

"فؤاد صادق نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اخوان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو تمغے دیئے جائیں بہت ٹال مٹول کے بعد ایک سرکلر جاری ہوا جس میں پندرہ مجاہدین کو انعامات دیئے کا اعلان کیا گیا تھا اور انکو بجائے جماعت اخوان المسلمین کے مصری رضا کاروں کی جماعت کی طرف منسوب کیا گیا۔ مصر میں اس وقت اخوان قید و بند اور طرح طرح کے مصائب میں مبتلا رکھے تھے۔"[۱۲]

اور پھر یہ انعامات بڑی خوشی سے قبول فرما لئے گئے۔

ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی مسلمان نے جہاد جیسا مقدس فریضہ ظالم حکومت سے تمغے حاصل کرنے کے لئے سرانجام دیا ہو۔

اخوان پر مسلح بغاوت کا الزام

اب ان حضرات کے دوسرے سفید جھوٹ کی حقیقت ملاحظہ فرمائیں کہ ۱۹۶۵ء میں برطانیہ، امریکہ اور اسرائیل کے اشارے پر اخوان المسلمین کو کچلا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات طول طویل ہیں اور طلوع اسلام کے اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں قارئین کی نگاہوں سے گذر چکی ہیں۔ اس وقت ہم ان الزامات میں سے صرف ایک الزام کو لیتے ہیں جس کا اخوان پر پابندی لگانے سے گہرا تعلق ہے۔ صدر ناصر خود الاخوان المسلمون کے ایک باضابطہ ممبر تھے بلکہ اخوان کے فوجی حلقہ کے ایک سرکردہ لیڈر۔ انقلاب مصر کے بعد انہوں نے اخوان کے لیڈروں کو وزارت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس دعوت کی وجہ سے اخوان میں کافی اختلاف پیدا ہوگئے۔ تاہم ان اختلافات کے باوجود اخوان کے بعض چوٹی کے لیڈروں نے وزارت قبول کرلی۔ ان میں سے ڈاکٹر محمد البہی ابھی تک موجود ہیں۔

اسی دوران حکومت کو خفیہ رپورٹ ملی کہ اخوان والے فوج میں اپنے زیر اثر حلقہ کے تعاون سے حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے کافی مقدار میں اسلحہ جمع کر چکے ہیں۔ حکومت نے بڑی تیزی سے چھاپہ مار کر الاخوان المسلمون کے ایک سرکردہ لیڈر کے قبضے سے اسلحہ کی اتنی بڑی مقدار برآمد کرلی جس سے حکومت مصر کا بڑی آسانی سے تختہ الٹا جاسکتا تھا۔ اب اسلحہ کی اتنی بڑی مقدار کا انکار تو ممکن نہ تھا، اسلئے اخوان والوں نے یہ صفائی پیش کی۔

---

[۱۲] ماہنامہ چراغِ راہ کراچی۔ مشرق اوسط نمبر۔ صفحہ ۱۳۶

"کہ یہ تو وہ اسلحہ ہے جو انقلاب سے قبل جمال عبدالناصر نے خود اپنی نگرانی میں فاروق کی نظروں سے بچانے کے لئے یہاں جمع کیا تھا۔"[۱۳]

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی فوجی حکومت اسلحہ کی اتنی بڑی مقدار سے تین چار سال تک غافل رہے؟ وہ تو بہ تقاضائے وقت عام شہریوں سے لائسنس یافتہ اسلحہ بھی جمع کروا لیتی ہے۔

الاخوان المسلمون اور تشدد

یاد رہے کہ اخوان المسلمین علی الاعلان تشدد کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس کی تائید میں یہ شرعی دلیل پیش کرتے ہیں کہ

"اپنی جان بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے طاقت کے استعمال کی اجازت دی ہے۔"[۱۴]

بلکہ وہ علی الاعلان کہتے پھرتے ہیں کہ جب بھی ہمیں موقع ملے گا، ہم صدر ناصر کو قتل کر دینگے۔ چنانچہ اخوان کے سرکردہ لیڈر ڈاکٹر سعید رمضان سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا کہ آپ صدر ناصر کی جان کے درپے ہیں تو انہوں نے بڑے فخر سے کہا۔

"صدر ناصر کی زندگی کے لئے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے لونگا۔"[۱۵]

یہ ڈاکٹر سعید رمضان اس وقت اخوان کے چوٹی کے لیڈر ہیں اور بانی جماعت حسن البنا کے داماد، اور اسلامک سینٹر جنیوا کے ڈائریکٹر ہیں۔

الاخوان المسلمون پر کفر کے فتوے

ہمارے یہ صالحین حضرات قدم قدم پر الاخوان کے اسلام کا واسطہ دیتے ہیں اور اس طرح ہمارے عامۃ الناس کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں کہ واقعی حکومت مصر نے اسلام کو ختم کرنے کے لئے ان کو کچلا ہے۔ جہاں تک ان کی دینی حیثیت کا تعلق ہے، مصر کے قدامت پرست علماء تو کجا، وہاں کے روشن خیال علماء تک نے، جو مصر میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہیں، ان کے خلاف کفر کے فتوے لگائے ہیں۔ اسکے متعلق جماعت اسلامی ہی کے ایک سابق امیر مولانا مسعود عالم ندوی کی زبانی سنیئے۔

"مصر کے سب سے بڑے سلفی عالم اور محقق شیخ احمد محمد شاکر نے (جن کی تحریریں نظام اسلامی کی حمایت میں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں) گزشتہ دور ابتلاء میں حد کر دی۔ یعنی الاخوان المسلمون کے کفر کا فتوے صادر کر دیا — العیاذ باللہ۔"[۱۶]

---

[۱۳] ترجمان القرآن لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲۶۷/۵۱

[۱۴] ہفت روزہ "ایشیا" لاہور۔ بحوالہ "مصر کے فرزندانِ توحید تختہ دار پر" مطبوعہ ملتان ص ۲۵

[۱۵] ایضاً۔ صفحہ ۲۶۔　　[۱۶] ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۳۸۱/۱۰۹

ان مختصر اشارات سے معلوم ہوگا کہ اخوان پر پابندی لگانے کے اصل وجوہ کیا تھے۔ اب ان پر مظالم کی داستان کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

اخوان پر مظالم کی داستان

جس وقت اخوان پر ان مظالم کی خبروں کی تفصیلات شائع کی جا رہی تھیں اس وقت قاہرہ میں تمام اسلامی ممالک کے علمائے دین کی ایک عظیم بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ تمام اسلامی دنیا کے سرکردہ علماء نے ان مظالم کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا تو جماعتِ اسلامی والے یہ خبریں کہاں سے حاصل کر کے شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ کرید پر معلوم ہوا کہ یہ تفصیلات ایک بین الاقوامی ادارہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں۔ عام اہل علم تو کجا خود جماعتِ اسلامی کے اکثر لوگوں کیلئے بھی یہ نام نامانوس سا تھا۔ اسلئے مولانا مودودی صاحب کو اس کا تعارف خود ہی کرانا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ۔

"یہ عالمی سطح پر قائم شدہ ایک ادارہ ہے جو دنیا کے مختلف ملکوں کے وکلاء، صحافی اور آزادی و مساوات اور انصاف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کسی سے ناانصافی ہو اُسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ادارہ جس کیس کو ہاتھ میں لیتا ہے اس پر اپنی پوری کوشش صرف کر دیتا ہے۔ خان عبدالغفار ایک مرتبہ اسی ادارے کی کوششوں سے رہا کئے گئے تھے۔۔۔۔۔۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ کیا اخوان کے کیس کو اسی ادارہ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ ابھی تک تو نہیں لے سکا لیکن وہ اس معاملہ پر پوری توجہ ضرور دے رہا ہے۔ حال ہی میں اس ادارے نے اخوان کے مقدموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے"۔ [۱]

اس ادارے یعنی ایمنسٹی انٹرنیشنل کے متعلق صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصے بعد (مارچ ۱۹۶۷ء میں) اس ادارے کے بانی مسٹر بینن سن (MR. BENENSON) نے اس سے استعفےٰ دے دیا تھا کہ اس ادارے کی ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین کو امریکی سراغرساں ادارہ سی۔ آئی۔ اے (C.I.A) کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی۔ اس لئے ان کے ضمیر نے انہیں اس ادارے سے وابستہ رہنے کی زیادہ دیر تک اجازت نہ دی۔

مصر میں تو اس جماعت (اخوان) پر پابندی تھی لیکن دوسرے عرب ممالک خاص کر اردن میں یہ جماعت بڑی فعال تھی۔ اور اسرائیل کو ختم کرنے کے سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کیا۔ معلوم

---

[۱] ہفت روزہ "ایشیا" لاہور جلد ۵۔ شمارہ ۳۔ صفحہ ۵۔

ہیں وہ کس بات کا انتظار کرتی رہی۔

عرب قومیت کی لعنت

جماعت اسلامی کے خیال کے مطابق، فلسطین میں عربوں کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ ان کا عرب قومیت کے غیر اسلامی نظریہ کا اپنانا ہے۔ ان حضرات نے اس بارے میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ۔

"آج عرب قومیت کا جو نعرہ لگایا جا رہا ہے اور اس کے پیچھے جو ذہن تیار کیا جا رہا ہے وہ اسلام کے خلاف ایک زبردست سازش ہے۔ اس کا ظاہری بڑا نقصان تو یہ ہے کہ ستر کروڑ مسلمانوں میں سے ۷ کروڑ عرب کٹ جاتے ہیں..... عرب قومیت کا نعرہ عیسائیوں، یہودیوں اور ان کے حاشیہ برداروں نے اس لئے عام کرنا چاہا کہ کسی طرح مسلمان اپنی اصلی بنیاد یعنی اسلام سے ہٹ جائیں[۳۱] ان کی دوسری کتاب (THE MIDDLE - EAST CRISIS) میں اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث کی گئی ہے جو تقریباً ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اس نظریہ کی مذمت، اور اسے یہودی سازش ثابت کرنے میں جتنا ممکن تھا زور لگایا گیا ہے۔ پھر صفحہ ۱۷ پر یہ ایک یہ فیصلہ سنایا گیا ہے کہ قومیت کی لعنت کی طرف زور شور سے بلانے والے صدر ناصر ہیں۔ اور ریڈیو قاہرہ نے عربوں کو عربی قومیت کے نشے سے مسحور کرنا شروع کیا ہے۔ (صفحہ ۱۷)۔ چنانچہ یہی عربی قومیت کا سحر ان کی شکست کا سبب بن گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عربوں کے اس نظریہ کا فلسطین کی شکست سے کیا رشتہ جڑتا ہے؟

اس میں کوئی کلام نہیں کہ قرآن کریم کا منتہیٰ یہ ہے کہ تمام عالم انسانیت کو دین کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری کے رشتے میں منضبط کر دیا جائے۔ اسلامی برادری درحقیقت اسی منتہیٰ کی طرف پہلا قدم ہے لیکن بہ حالات موجودہ جب مسلمان مختلف مملکتوں کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں، اس منتہیٰ تک پہنچنے کا عملی اور قرین حکمت طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک مملکت اپنے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے داخلی طور پر اس میں قرآنی تعلیم کو عام کیا جائے، اور خارجی طور پر ہر مملکت، دیگر اسلامی مملکتوں سے برادرانہ تعلقات استوار کرے اور برقرار رکھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس عالمگیر برادری کا وجود عمل میں آجائیگا جس میں اعشریت، قطرہ، دریا میں جذب ہو جانے کا نام ہوتا ہے۔ مسلمان ممالک میں جو قومیت کا تصور بیدار ہو رہا ہے تو اس سے مراد ہر مملکت یا اسلامی ملک کا اندرونی اتحاد ہے۔ یہی جذبہ ہمارے نزدیک، عربی قومیت کے احساس کا محرک ہے۔ یہ چیز اسلام کے خلاف نہیں۔ (اسلام کے خلاف یہ نظریہ ہے کہ نسل یا وطن کی بنیادوں پر، مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک امت کی تشکیل کی جائے) یہی وجہ ہے،

---

[۳۱] عالم اسلام اور یہودیت - صفحہ ۳۶

کہ عربی قومیت کی تحریک کے بانیوں میں ایسی ایسی ہستیاں شامل ہیں جن کا شمار خود جماعت اسلامی کے نزدیک اکابرِ دین میں ہوتا ہے۔ اس تحریک کے اجمالی تعارف کے طور پر یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ۱۸۵۷ء میں شام میں

عرب قومیت کی تحریک

ایک علمی سوسائٹی الجمعیۃ العلمیۃ السوریۃ قائم ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کے متعلق یہ حضرات کسی کتاب سے یہ حوالہ نقل کرتے ہیں۔

"اس سوسائٹی کا قیام دراصل اجتماعی قومی بیداری کا پہلا خارجی مظہر تھا۔ تاریخ میں اس کی اہمیت اس سے ہے کہ یہ ایک نئی سیاسی تحریک کا گہوارہ ثابت ہوئی۔"[۱۹]

یہی سوسائٹی عربوں میں قومیت کی تحریک بیدار کرنے کی ذمہ دار قرار دی گئی۔

"پھر علم و تحقیق کے نام پر عیسائی مشنریوں اور مغربی استعماری طاقتوں نے اس سیاسی تحریک کا آغاز کیا اور بالآخر وہ عربوں کے اندر ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔"[۲۰]

اس سوسائٹی کے بانیوں میں سے جس نے عربوں میں "قومیت کی لعنت کے بیج بوئے"، ایک صاحب امیر شکیب ارسلان تھے۔ اس سوسائٹی سے ان کے تعلق کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ تاعمر حیات اس کے صدر رہے۔[۲۱] امیر شکیب ارسلان کے متعلق اسی رسالہ "چراغِ راہ" کے مسعود عالم نمبر

محبوب ترین ہستی

میں جماعتِ اسلامی کے ایک سابق امیر مسعود عالم ندوی کے بارے میں لکھا ہے کہ:-

"انہیں امیر شکیب ارسلان سے محبت و عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق ہے۔ وہ اپنی ہر تصنیف میں کسی نہ کسی مناسبت سے ان کا ضرور ذکر کریں گے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ سید جمال الدین کے شاگرد اور انکے طریقِ فکر و عمل کے داعی امیر شکیب ارسلان سے کون واقف نہیں۔ ساری عمر علمی و عملی جدوجہد میں بسر ہوئی۔ عربی کا تو کیا کہنا کہ یہ دورِ حاضر میں عربی زبان و ادب کے امام تھے۔ جرمن اور دوسری مغربی زبانوں سے واقف تھے۔"[۲۲]

یہ ہیں ان کے محبوب امیر شکیب ارسلان جو عرب قومیت کی بنیاد رکھنے والی سوسائٹی کے بانی تھے۔ لیکن عرب قومیت کے یہ الفاظ اب اگر کسی اور کی زبان پر آ جاتے ہیں تو وہ فوراً اسلام کیخلاف سازش قرار پاتا ہے۔

دارالعروبۃ؟ دارالعربیۃ کیوں نہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو یہ ہیر پھیر کسی خاص مجبوری کے تحت کرنا پڑ رہا ہے ورنہ انہوں

۱۹؎ "چراغِ راہ" مشرقِ اوسط نمبر صفحہ ۹۴ - ۲۰؎ ایضاً - ۲۱؎ ایضاً

۲۲؎ "چراغِ راہ" مسعود عالم ندوی نمبر صفحہ ۱۰۷

نے تو عربوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنے ایک ادارے کا نام عرب قومیت کے تصور پر "دارالعروبۃ" رکھا ہوا ہے۔ عروبۃ کے معنی ہیں عرب قومیت۔ اگر مودودی صاحب کی کتابوں کے عربی ترجمے ہی کرنے تھے تو اس ادارہ کو دارالعربیۃ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا تھا۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ ایک خاص عرب ملک کے سربراہ کی زبانی عرب قومیت کا لفظ سنکر انہیں اسلام کیخلاف سازش کی بُو آجاتی ہے لیکن خود اپنے ادارے کا نام "عرب قومیت" رکھنے سے انہیں کسی قسم کا تأمل نہیں ہوتا۔

اسلامی حکمران، علماءِ عرب اور عرب قومیت

یہ حضرات عامۃ الناس کو یہ تأثر دینے کی کوشش کررہے ہیں کہ ایک خاص عرب ملک کا سربراہ اسلام کیخلاف سازش کے طور پر عربی قومیت کا نعرہ بلند کررہا ہے۔ لیکن جس شخص کو عرب دنیا کے معاملات سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ چاہے وہاں کے اسلامی حکمران ہوں یا علمائے اسلام، وہ پہلے عرب کا لفظ بولتے ہیں اور بعد میں اسلام کا۔ مثلاً اسی جنگِ فلسطین ہی کے موقع کے ایک دو بیانات ملاحظہ فرمائیے۔ سعودی عرب کی حکومت کو یہ حضرات خلافتِ راشدہ کی مثیل قرار دیتے ہیں۔ اس کے حکمران جنگ کے بعد اپنی قوم کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہیں۔

"اخوانی ابنا الشعب لقد کنتم دائماً فی الطلیعۃ لنصرۃ اخوانکم العرب والمسلمین۔"[23]

(اے میری قوم! تم ہمیشہ اپنے عرب اور مسلمان بھائیوں کی امداد میں پیش پیش رہے ہو)

شاہ مراکش اپنا خطاب ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔ ان یعید اللہ الی العرب و المسلمین قوتنا و کرامتنا۔[24] (امید واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ عربوں اور مسلمانوں کی قوت اور عزت انہیں لوٹائیگا)

مجلۃ رابطۃ العالم الاسلامی کے اسی شمارے میں عرب کے علمائے اسلام کے پیغام شائع ہوئے لیکن سب نے پہلے عرب اور بعد میں اسلام کا نام لیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶۲، ۷۷ وغیرہ۔

قارئین ان تفصیلات کو پڑھتے ہوں گے اور حیران ہوتے ہوں گے کہ اس عرب قومیت کا فلسطین کی جنگ اور شکست سے کیا تعلق ہے۔ لیکن جو حضرات اس مسئلہ کو اسلام کے خلاف سازش کے طور پر اُجاگر کررہے ہیں، تو وہ بلاوجہ ایسا نہیں کررہے۔ اس کی وجہ مضمون کے آخر میں معلوم ہوجائے گی۔

فرعونیت کا الزام

اسی عربی قومیت کے ذیل میں ایک الزام یہ بھی لگایا گیا ہے کہ اسی قومیت کی لعنت کے اثر کیوجہ سے مصر کے نئے دستور میں فرعونی تہذیب کے احیاء کا عہد و پیمان کیا۔[25]

---

[23] مجلۃ رابطۃ العالم الاسلامی۔ جلد ۵۔ نمبر ۷ صفحہ ۸۰۔ [24] ایضاً۔ صفحہ ۸۱۔

[25] THE MIDDLE EAST CRISIS صفحہ ۶۷

گیا ہے۔

ان حضرات کو جھوٹ بولتے وقت شاید قیامت کا خوف بھی نہیں رہتا۔ مصر کا موجودہ دستور جو ۱۹۶۴ء میں جاری ہوا تھا، ۱۶۹ دفعات پر مشتمل ہے۔ اس کی کسی ایک دفعہ سے بھی بالوضاحت تو کیا اشارۃً بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ اس قسم کا کوئی عہد و پیمان کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی دفعہ نمبرہ میں یہ واضح اعلان موجود ہے کہ اسلام اس ریاست کا دین ہے۔

جہاں تک فرعونی تہذیب کے احیاء کا تعلق ہے، مصر کے بعض اہل قلم صدر ناصر سے بھی پہلے سے اٹھاتے رہے۔ لیکن انقلاب مصر کے بعد یہ تحریک اپنی موت آپ مرنی شروع ہو گئی۔ قاہرہ کے ایک مشہور اسلامی اہل قلم انور جندی 'دعوۃ الحق' مراکش کے تازہ پرچے میں لکھتے ہیں کہ "مصر میں ایک مکتبِ خیال کے لوگوں نے فرعونی تہذیب کی دعوت دینی شروع کی تھی، لیکن مسلمانوں نے ان افکار کا مقابلہ کیا اور یہ تحریک اپنی موت آپ مر گئی۔"[26]

اور پھر عربی قومیت کے بارے میں لکھتے ہیں:-

عربی قومیت کی حقیقت

"وقد حاول الاستعمار ان یوجد تناقضا بین الوحدۃ العربیۃ والاخوۃ الاسلامیۃ او بین العروبۃ والاسلام ولکن الفهم السلیم للاسلام ینفی هذا التناقض فان الاسلام لا یعارض الانظمۃ السیاسۃ المختلفۃ ولا یحجب القومیۃ او الوحدات الوطنیۃ ما دامت لا تتعارض مع جوهرہ۔"[27]

وحدتِ عربی یا عربی قومیت اور اسلامی اخوت کے درمیان تناقض دکھانا استعماری طاقتوں کی سازش ہے۔ لیکن جن لوگوں میں اسلام کی فہم سلیم ہے وہ اس میں کوئی تناقض محسوس نہیں کرتے کیونکہ اسلام مختلف سیاسی تنظیموں کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہی وہ قومیت اور وطنی تحریکوں کو جبکہ وہ اس کے جوہر کے خلاف نہ ہوں، مجرا سمجھتا ہے۔

اب آگے بڑھیے:-

عرب سوشلزم

جنگِ فلسطین میں عربوں کی شکست کا ایک تیسرا بڑا سبب عرب سوشلزم کو قرار دیا گیا ہے جسے انقلابی نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اسلامی سوشلزم بھی۔

---

[26] دعوۃ الحق مراکش۔ جنوری ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۰۔ [27] ایضاً۔

واضح رہے کہ اسلامی دنیا کو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح دینے والے اخوان المسلمین ہی کے اہل قلم تھے ۔ ان حضرات (جماعت اسلامی کے حضرات) کا ارشاد یہ ہے کہ صدر ناصر کے اس مخصوص نعرے نے عربوں میں جو نفاق کے بیج بو دیئے، تاریخ ان کی مثال لانے سے قاصر ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔[۹]

ہم نے اختصار کی غرض سے چودھری غلام محمد صاحب کا صرف یہی ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس جماعت کی درجن بھر کتابوں میں موقع بہ موقع یہی گردان کی گئی ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اس نعرہ کی وجہ سے عربوں میں نفاق کا بیج کس طرح بویا گیا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی ...... کہ وہ چاہتے تھے کہ ان وجوہات کی طرف اشارہ کئے بغیر صدر ناصر کو مطعون کرنے کا مقصد حاصل کر لیا جائے۔ دیکھئے اس نعرہ کے وہ مضمرات کیا تھے جن کی وجہ سے (جماعت اسلامی کے خیال کے مطابق) صدر ناصر گردن زدنی قرار پاتا ہے۔ صدر ناصر نے فیصلہ کیا تھا کہ

(۱) دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لئے ہر فرد معاشرہ کے لئے خالص آمدنی کے طور پر اسی ہزار روپے کی حد مقرر کی گئی۔

(۲) زمین کی انفرادی ملکیت دو سو ایکڑ مقرر کی گئی۔ اسی حد کے مقرر کرنے پر اخوان المسلمین سے چپقلش ہو گئی تھی جس (اخوان) میں پانچسو ایکڑ کی حد مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اور صدر ناصر پچاس کی۔ صدر ناصر نے اس اقدام کی وضاحت اپنے الفاظ میں یوں فرمائی۔

" التطبيق العربي الاشتراكي لا يؤمن بتأميم ملكية الارض ولكن بزيادة عدد الملاك "[۱۰] ۔ عرب سوشلزم کی تطبیق کا مقصد اراضی ملکیت کو سلب کرنا نہیں بلکہ اس کے ذریعے مالکانِ اراضی کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے "

چنانچہ جماعت اسلامی کی طرف سے یہ فتویٰ دیا گیا کہ

" یہ وہ سوشلزم ہے جو یوگوسلاویہ اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں نافذ ہے۔ اسلام کو اس سے کوئی واسطہ نہیں "[۱۱]

اسلام سے تعلق — لیکن اب آپ نے جو کہا تھا کہ — حذرا سے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں — تو جماعت اسلامی پر فطرت کی تعزیر ایسی برق خاطف بن کر گری کہ ان کے چندہ کا گھروندہ اور اسلام پرستی کا فریب خاکستر بن کر رہ گیا۔ ابھی ان کے مذکورہ بالا فتوے کی روشنائی بھی

---

[۹] میگزین ۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۹ ۔ [۹] پاکستان ٹائمز ۔ صفحہ ۷۱ ۔ THE MIDDLE EAST CRISIS

[۱۰] المشتری الثقافية ۔ مارس ابریل ۱۹۶۵ء ۔ [۱۱] ترجمان ۔ اپریل ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۷

ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ زمانے کے تھپیڑوں سے مجبور ہو کر انہیں خود یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ نجی خالص آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے [۳۲] اور زمین کی ذاتی ملکیت زیادہ سے زیادہ دو سو ایکڑ تک ہونی چاہیئے [۳۳]

یوں مصری حکومت کی سوشلزم یکسر خلاف اسلام' اور ان کی سوشلزم "اسلام کا امتیازی نظریہ معیشت" قرار پاگئی۔

دردسری کا مقصد

اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں اس امر کا اندازہ ہو سکیگا کہ یہ ساری دردسری کس مقصد کے لئے تھی. چنانچہ اس کی جھلک ہمیں ان کی ان مختلف تجاویز میں نظر آتی ہے جو انہوں نے مسئلہ فلسطین کے حل کرنے کے لئے پیش کی ہیں. ان میں سے اہم ترین تجاویز مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) عربوں کو سوشلسٹ ممالک سے قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ ان سے مسئلہ فلسطین میں کسی حمایت کی توقع نہیں۔

(۲) عرب اتحاد کے نعرے کو بھلا کر تمام اسلامی ممالک کا اتحاد قائم کیا جائے۔

(۳) عربوں کی موجودہ ناقابلِ اعتماد قیادت کو ختم کیا جائے۔

پہلی اور دوسری تجویز کے بارے میں ان کا مشورہ مختصراً خود ان کی زبانی سنیئے:۔

" اس کام کو بخوبی انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ پورے عالمِ اسلام کو ایک سیاسی قوت کی شکل میں منظم کیا جائے اور اس طرح بین الاقوامی میدان میں ایک نئی مشترک قیادت اُبھرے جو کوئی مثبت کردار ادا کر سکے اس میں ہمارے عرب بھائیوں کو بھی ان کا مقام حاصل ہوگا۔ لیکن یہ اشتراک عربیت کی کمزور بنیاد پر نہیں' بلکہ اسلام کی مستحکم بنیاد پر ہوگا " [۳۵]

دونوں تجاویز ایک عرب کی نظر میں

ہم ہزار جان سے چاہتے ہیں کہ مسلمان ممالک غیر مسلموں سے روابط قائم کرنے کے بجائے خود اپنوں سے تعلقات بڑھائیں۔ لیکن یہاں سوال محض جذبات کا نہیں، عملی امکانات کا ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ اگلے دنوں ملائشیا میں اسلامی ممالک کی ایک نیم سرکاری کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں الفتح کے فلسطینی نمائندوں کو اندر تک نہیں جانے دیا گیا۔ دوسری طرف' عنقریب غیر جانبدار ممالک کی ایک سرکاری کانفرنس منعقد ہونے

---

[۳۲] چراغِ راہ۔ سوشلزم نمبر، صفحہ ۵۱۸۔ [۳۳] ماہنامہ ترجمان القرآن۔ بابت اپریل ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۱۳

[۳۴] چراغِ راہ۔ مضمون مولانا نعیم صدیقی صاحب۔ [۳۵] چراغِ راہ۔ مشرقِ اوسط نمبر، صفحہ ۲۳

والی ہے۔ الجزائر نے منوالیا ہے کہ اس میں فلسطین کی نمائندگی الفتح کے جیالے کریں گے۔ خود امیر جماعت اسلامی کی اپنی یہ حالت ہے کہ انہوں نے سابقہ انتخابات کے سلسلہ میں اعلانیہ کہا تھا کہ ہم مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں ایک ہندو امیدوار کو ترجیح دیں گے۔ ان کی نہایت معصومانہ تجویز کہ عرب ممالک کو سوشلسٹ ممالک سے قطع تعلق کر لینا چاہیئے، کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ یہ یا تو امریکہ اور برطانیہ کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوں اور یا دنیا میں بے یار و مددگار رہ کر اسرائیلیوں کے پنجۂ فولاد کے ابدی اسیر ہو جائیں۔ اس وقت عربوں کے لئے بہترین مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمہیں جہاں سے بھی مدد مل سکتی ہے حاصل کرو اور باہمی اتحاد سے اسرائیل کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دو۔

ناقابلِ اعتماد قیادت کا خاتمہ

ان کی تیسری تجویز عرب ممالک میں ناقابلِ اعتماد قیادت کا خاتمہ کرنا ہے۔ اور یہی وہ سب سے اہم تجویز ہے جس کے لئے ان بیچاروں نے درجن بھر کتابیں شائع کی ہیں۔ اس لئے ہم اسے کسی قدر تفصیل سے انہی کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

"میدانِ معرکہ میں فوجوں کی فتح و شکست دراصل نظامہائے حیات کی فتح و شکست ہوا کرتی ہے۔ اسلئے جو نظام اپنی فعالیت میدانِ جنگ میں ثابت کرنے سے عاجز ہوں، ان کو اپنی قوموں کی گردنوں پر مسلط رہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ یا تو اپنے آپ میں ایسی جوہری اور اساسی تبدیلیاں کریں جن کی عدم موجودگی کو شکست کا اصل ذمہ دار گردانا جاتا ہے، یا پھر دوسرے نظاموں اور اس کے علمبرداروں کے لئے جگہ خالی کر دیں۔" [۳۶]

اس بارے میں چوہدری غلام محمد صاحب امیر جماعت اسلامی کراچی یوں تفصیل سے فرماتے ہیں۔

"دوسری طرف جو طبقہ بیرونی نظریات کو تسلیم کر چکا ہے، اسکے پاس سوائے دنیاوی عیش و عشرت کے اور کوئی نصب العین نہیں۔ اس سے وہ نہایت آسانی سے مال اور عورت کا شکار ہو جاتا ہے جس کی کمی نہ مغربی ممالک کے پاس ہے اور نہ یہودیوں کے پاس اور نہ روسیوں کے پاس۔ اپنے اپنے مقاصد کے لئے یہ تینوں طاقتیں اس میں کامیاب ہیں۔ اور انہوں نے فوج اور سول سروس میں اپنے لئے آلۂ کار تیار کر رکھے ہیں۔ اور یہی آلۂ کار طبقہ درحقیقت عربوں کی شکست کا سب سے بڑا سبب ہے اور اس طرح کے لوگ عرب قیادت کی بالکل اگلی صفوں میں موجود ہیں اور ان کی نشاندہی کی جائے تو شاید بہتوں کی جبینوں پر شکن پڑ جائے۔ مگر حقائق حقائق رہتے ہیں اور کوئی خوش فہمی، حسن ظن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب تک یہ لیڈرشپ خواہ وہ سیاسی ہو یا فوجی، علمی ہو یا فکری، عربوں کی گردنوں پر مسلط ہے، عربوں کی قسمت پر مہر لگی ہوئی ہے۔" [۳۷]

---

[۳۶] "چراغ راہ" مشرق اوسط نمبر صفحہ ۱۳۹۔ [۳۷] ایضاً صفحہ ۶۶۔

عربوں کی اس ناقابلِ اعتماد قیادت کا وجود کن عرب ملکوں میں ہے؟ اس کی وضاحت بھی انہی سے سنیئے:۔

"اس وقت عرب دنیا کا اصل مسئلہ قابلِ اعتماد اور جرأت مند قیادت کا مسئلہ ہے۔ مصر اور شام کی حکومتوں کو حقیقی عوامی تائید حاصل نہیں۔ ان پر سخت احساسِ کمتری کی کیفیت طاری ہے۔ نہ ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ شکست کی ذمہ داری قبول کر کے دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دیں"[۳۸]

یہ ہے وہ مقصد اور محور جس کے گرد ان کی درجن بھر کتابیں گھومتی ہیں۔ مسئلہ فلسطین ہو یا اسلام کا احیاء، ان حضرات کا مقصد یہی ہے کہ عرب عوام کو صدر ناصر کے خلاف بھڑکایا جائے۔ اور یہ وہ مقصد ہے جس کا اظہار یہ لوگ اس وقت سے کر رہے ہیں جب سے صدر ناصر نے اقتدار سنبھالا ہے۔ آج سے پندرہ سال پہلے یعنی ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا۔

"جمال ناصر سے مصری عوام بھی بیزار ہیں اور فوج کا بڑا حصہ اس کا حامی نہیں ہے۔ مگر اس شخص کی سازش کا یہ کمال ہے کہ عوام و خواص کی اس بیزاری کے باوجود اقتدار کی کرسی کو وہ ہتھیائے ہوئے ہے۔ لیکن کاغذ کی یہ ناؤ انشاءاللہ زیادہ دن تک نہ چل سکیگی۔ سازش کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جمال ناصر مغرب زدہ دل و دماغ رکھتا ہے"[۳۹]

لیکن یہ کاغذ کی ناؤ چلتی رہی جس سے ان حضرات کی بے چینی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے فلسطین کے المیئے تک کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے سے گریز نہ کیا۔

نتیجہ بحث اس ساری بحث کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک عربوں نے جو فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے وسیع پیمانے پر گوریلا لڑائی شروع کر رکھی ہے اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہ ہوگا جب تک کہ مصر اور شام کی موجودہ ناقابلِ اعتماد قیادتوں کا خاتمہ نہیں کر دیا جاتا، اور جب تک عرب ان ناقابلِ اعتماد قیادتوں کا خاتمہ نہیں کر لیتے، انکی قسمتوں پر مہر ہی لگی رہے گی۔

قارئین نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس گھناؤنی تجویز کے پیچھے کیا کیا خطرناک عزائم ہیں۔ یہ حضرات جانتے ہیں کہ فلسطین میں گوریلا لڑائی لڑنے والے عرب نوجوانوں کے جذبات اس حد تک بھڑک چکے ہیں کہ اگر کہیں انہیں ہلکا سا شبہ بھی ہو جائے کہ کوئی عرب حکومت ان کے عزائم میں رکاوٹ ڈال رہی ہے تو وہ اس سے بھی ٹکر لینے

---

[۳۸] ماہنامہ "چراغِ راہ" مشرقِ اوسط نمبر۔ صفحہ ۹

[۳۹] ماہنامہ "فاران" نومبر ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲

سے دریغ نہیں کرتے۔ پچھلے دنوں حکومت لبنان کو اس کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ حضرات انتہائی سادگی اور چالاکی سے انہیں مصر اور شام کی قنیا دتوں سے الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی ان ناپاک کوششوں میں کامیاب ہو جائیں اور عرب چھاپہ مار فلسطین میں گوریلا لڑائی لڑنے کی بجائے شام اور مصر کی "قنیا دتوں" سے اُلجھ جائیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کا کیا حشر ہو گا۔ اس سازش کی آگ درحقیقت الاخوان المسلمون کی سلگائی ہوئی ہے، جو استعمار پسند سرمایہ دار قوتوں کا خود کاشتہ پودا ہے اور جس کی شنی پاکستان میں جماعت اسلامی ہے، ان کے پیشِ نظر مقصد صرف ایک ہے اور وہ مقصد ہے سرمایہ دار استعمار پسند قوتوں کے مفاد کا تحفّظ۔ اسی کی خاطر یہ لوگ اتنے پاپڑ بیلتے رہتے ہیں۔

آخر میں، ہم اتنا واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے پیشِ نظر نہ کسی خاص مملکت یا صاحبِ مملکت کی تائید ہے، نہ کسی دوسرے کی تنقیص۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے عزائم و مقاصد کیا ہوتے ہیں اور وہ انہیں نقاب کیا اوڑھاتی ہے اور وہ عوام فریبی کے لئے پراپیگنڈہ کے فن میں کس قدر مہارت رکھتی ہے۔

لیکن پراپیگنڈے کے فن کی کامیابی کے لئے خالی مہارت کافی نہیں۔ اس کے لئے فراواں روپے کی بھی ضرورت ہوتی ہے ــ اور وہ "اللہ کے فضل سے" ان کے ہاں بہت ہے۔

فرنگ آئینِ رزاقی بداند
بہ این بخشد ازو وامی ستاند
بہ شیطاں آں چناں روزی رساند
کہ یزداں اندراں حیراں بماند

(اقبالؒ)

(بقیہ "اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" صفحہ ۱۶ سے آگے)

جو شخص محمدؐ کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود یقیناً مر گیا۔ لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں۔ اس وضاحت سے مطلب یہ تھا کہ حضورؐ کی وفات سے اس نظام میں کوئی کمی نہیں آسکتی جو وحی کے اتباع سے آپ نے قائم کیا۔ وحی ہمارے پاس مکمل شکل میں محفوظ موجود ہے۔ اور سرورِ دو عالم نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس سے متمسک رہتے ہوئے تم کبھی نہیں بھٹکو گے اور یہ چیز خدا کا کلام قرآن حکیم ہے۔ اسی کے نور کی روشنی اور اسی کی آیات کی رہنمائی میں ہر زمانے میں وہی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے عہد میں انکے ہاتھوں رونما ہوا۔ غرضیکہ قرآن نے پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں کا علاج وحی خداوندی کی پیروی میں رکھا ہے۔ ما فوق البشر قوتوں کو حاصل کرنے یا انکے انتظار میں رہنے کا سبق نہیں سکھایا۔ اس نے جنت سے نکلے ہوئے آدم سے یہی کہا تھا کہ تم اپنے اس تنزل کا غم نہ کرو۔ تمہارے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی برومندی کے ساتھ تم پھر بلندیوں کو حاصل کر لوگے اور اس اصول کو کبھی نہ بھولو کہ اِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطہ رہنمائی آئے گا۔ جو اس کا اتباع کرے گا اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہوگا۔

یہی تھا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بشریت اور بعثت کا مقصد اور یہی ہے ہماری زندگانی کا مطلوب۔ اور یہی ہونا چاہیئے ہماری حیات کا نصب العین۔ آج کا مقدس دن کل نوعِ انسان کو پکار پکار کر بقائے انسانیت کی دعوت دیتا ہے۔ آیئے ہم بھی اس دعوت کو قبول کر کے خدا کے ان بندوں میں شامل ہو جائیں جن کا ہر قدم خدا کے قانون کی طرف اٹھتا ہے اور جو ہر آن خدا کی مرضی کے مطابق ارتقائے انسانیت کی منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ والسلام!

کوئٹہ میں —— ادارہ طلوع اسلام کی جملہ مطبوعات

گوشۂ ادب

جناح روڈ۔ نزد ریگل سینما (ٹیلیفون ۳۰۰۹) سے دستیاب ہو سکتی ہیں!

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفرین شاہکار

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ انکا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اسکی تعلیم کیا ہے، اسکی دعوت کیا ہے، قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اسکا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۱۲ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے میں۔

اسلام کیا ہے؟

یہ پہلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپکو بتائیگی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسکی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض وغایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ چیپ ایڈیشن۔ چار روپے۔

سلیم کے نام

سلیم ایک تعلیمیافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کے جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول۔ آٹھ روپے۔ حصہ دوم۔ سوم۔ چھ چھ روپے۔

نظامِ ربوبیت

نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اسکے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملیگی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ ۴ روپے۔

خدا اور سرمایہ دار

موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے انکا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت (قسم اعلیٰ) مجلد۔ نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے۔

اسبابِ زوالِ امت

ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اسلئے ہم ذلیل ہیں۔ سٹرک کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو روپے۔

ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ فطرتِ انسانی

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے درس قرآن مجید میں (جس کی رپورٹ 'ایشیا' بابت ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے) فرمایا:

> دوسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان کے اندر اخلاقی حس رکھ دی گئی ہے اسکی فطرت میں یہ بات اتار دی گئی ہے کہ بُرا کیا ہے اور بھلا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ بُرے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر بُرے اور بھلے کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور اگر خدا کی طرف سے ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ ان میں تمیز کر سکتا ہے، تو پھر خدا کی طرف سے ہدایت بھیجنے کا فائدہ کیا ہے؟ جو لوگ وحی کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ بُرے بھلے کی تمیز انسانی فطرت میں موجود ہے، اسلئے اسے کسی خارجی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز بکری کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ گھاس اس کے لئے "حلال" ہے اور گوشت "حرام"۔ وہ مرتی مرجائے گی لیکن گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ جنگل کا بادشاہ، شیر، اتنی مہیب قوت کا مالک ہوتے ہوئے، بھوکا مرجائے گا لیکن گھاس پات کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ گوشت خور ہے۔ مرغی کے چوزے کو لاکھ گھیر کر لاؤ، وہ پانی کے حوض میں کبھی نہیں اترے گا۔ کیونکہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ پانی اس کے لئے ہلاکت آفریں ہے۔ بطخ کا بچہ لپک کر پانی کی طرف جائے گا۔ انہیں ان کی فطرت کے تقاضوں کو بتانے کے لئے، نہ کوئی رسول آتا ہے نہ کتاب۔ وہ پیدائش کے ساتھ ہی فطرت کی مقرر کردہ راہ پر چل نکلتے ہیں اور ساری عمر اسی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ اسلئے کہ جو بات کسی کی فطرت میں داخل ہو، وہ نہ بدلی جا سکتی ہے نہ بھلائی۔ نہ ہی کسی کو اس کی یاد دہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی جانور سے اس کی فطرت کے خلاف کوئی کام کرانا ہو تو ہزار جتن کر کے اُسے اس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور

جونہی یہ جبر کی زنجیر ٹوٹتی ہے تو وہ بھاگ کر فطرت کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

یہ ہے اشیائے کائنات اور جانوروں کی کیفیت جن کی فطرت کے اندر ان کے بُرے اور بھلے کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کی تو یہ کیفیت نہیں۔ انکی طرف آسمانی راہ نمائی آتی تھی (جو اب قرآن میں محفوظ ہے) جو بُرے اور بھلے کی تمیز بتاتی تھی۔ رسول آکر ان سے کہتا یہ تھا کہ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷/۶۲) میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اگر یہ تمیز اُن (انسانوں) کے اندر موجود ہوتی تو ان سے یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس کا تمہیں علم نہیں۔ وہ رسول کی آمد سے پہلے فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ہوتے تھے۔ (۳/۱۶۴)۔ یعنی بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں۔ کیا کوئی حیوان بھی (جس کے اندر بُرے اور بھلے کی تمیز موجود ہوتی ہے) کبھی ضلال مبین — گمراہی — میں ہوتا ہے؟ وہ تو کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ انسانی فطرت کے غلط تصور نے کس قدر گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر انسانی فطرت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان اپنے کسی عمل کے لئے ذمہ دار قرار نہیں پاتا — ہم کبھی شیر کو پھانسی پر نہیں لٹکاتے کہ اس نے فلاں انسان کو مار کیوں ڈالا تھا — نہ ہی اس کی طرف خدا کی طرف سے وحی — نبی اور رسول — آنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فطرت انسانی کا عقیدہ، وحی کے منکرین نے وضع کیا۔ لیکن اس کی تبلیغ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ حرام جو یہ لوگ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور اب کہنے کے نتائج اور اثرات کیا ہیں۔ بس بھیڑوں کی ایک قطار ہے جو صدیوں سے اس راستے پر چلی جا رہی ہے جس پر کبھی کوئی پہلی بھیڑ چلی تھی۔ كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ (۲/۱۷۱)

(۰)

۲۔ اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی

ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ ہر شخص کی عمر مقدر ہوتی ہے۔ اور خدا نے عمر ماپنے کا ایک طریقہ یہ مقرر کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی تمام عمر میں جس قدر اناج کھانا ہوتا ہے، وہ متعین کر دیا جاتا ہے۔ جب کسی کا دانہ پانی ختم ہو جاتا ہے، وہ مر جاتا ہے۔ بعض بزرگوں نے اپنی عمر بڑھانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ دن رات میں سات دانے گیہوں کے کھاتے تھے۔ اس طرح آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان کے حصے کا مقرر کردہ جو اناج (مثلاً) ساٹھ برس میں ختم ہو جاتا تھا، وہ کتنے برسوں میں جا کر ختم ہوگا۔

اس کے بعد، اللہ میاں نے، اناج کے بجائے انسان کے سانس مقرر کر دیئے۔ جب سانسوں کی مقررہ تعداد

ختم ہو جاتی، وہ انسان مر جاتا۔ اب آپ دیکھئے کہ ان حضرات نے اس سے بچنے کے لئے کیا تدبیر نکالی! پاکستان ٹائمز کی ۲۴ مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں حضرت میاں میرؒ کے کوائفِ حیات شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

> حضرت میاں میرؒ کی درازیٔ عمر کا راز یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی سانس روک لیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شب بھر میں صرف ایک یا دو دفعہ سانس لیتے تھے۔ حبسِ دم (پاسِ انفاس) یعنی سانس روک لینا، ایک ایسی مشق ہے جسے فقراء حضرات بطور مذہبی عمل کے سرانجام دیا کرتے ہیں۔ اس طریق سے عمر بڑھانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک شخص نے اپنی زندگی میں جتنے سانس لینے ہوتے ہیں وہ ازل سے مقرر شدہ ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر آہستہ آہستہ سانس لئے جائیں گے، اتنی ہی عمر بڑھ جائے گی۔

اب دیکھئے اللہ میاں اور کونسا طریق تجویز فرماتے ہیں اور یہ حضرات اس سے بچ نکلنے کی کیا تدبیر سوچتے ہیں۔

ضمناً آپ نے ہندو سادھوؤں کے متعلق سنا ہوگا کہ وہ دم روک کر چالیس چالیس دن اپنے آپ کو گڑھے میں دبائے رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے ہاں تصوف کی یہ ریاضتیں اور مراقبے کہاں سے آئے ہیں؟ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔

آپ دیکھئے کہ ان بزرگوں کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں!

(-)

۳۔ شیخ چُپ بیٹھے توکل ٹھہرے

مسٹر بھٹو نے جب یہ سلوگن دیا کہ (۱) اسلام ہمارا دین ہے۔ (۲) جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اور (۳) سوشلزم ہمارا معاشی نظام، تو جماعتِ اسلامی نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ یہ تثلیث فی التوحید ہے۔ اس سے اسلام صرف خدا کے ساتھ ذاتی تعلق کا نام رہ جاتا ہے، اور دنیاوی امور کے لئے دوسرے گوشوں کی طرف رُخ کرنا پڑتا ہے۔ اسے سیکولرازم کہتے ہیں۔ (ہم خود اس سے متفق تھے کہ یہ سیکولر اسلام کا تصور ہے)۔ لیکن غور فرمائیے کہ ان حضرات کی اپنی کیا حالت ہے۔ پچھلے دنوں جب مودودی صاحب نے ایک سال کی رخصت کے بعد پھر زمامِ امارت بے محابانہ انداز سے اپنے ہاتھ میں لی تو اس تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ملک میں ایسی جماعتوں کو پنپنے کا موقعہ نہ دے جو اسلام اور جمہوریت کے راستے سے ملک کو ہٹا کر طاغوتی نظام قوم پر مسلط کرنا چاہتی ہیں یا ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے درپے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان جماعتوں اور افراد کی مدد فرمائے جو یہاں اسلام اور جمہوریت کے لئے کام کر رہی ہیں۔

(ایشیا، ۳۱ مئی ۱۹۶۹ء)

سوال یہ ہے کہ اگر "اسلام، جمہوریت اور سوشلزم" تثلیث ہے جو سیکولر نظام ہی میں بار پا سکتی ہے، تو کیا "اسلام اور جمہوریت" ثنویت نہیں؟ کیا "اسلام" کہنے سے جمہوریت خود بخود اس کے اندر نہیں آجاتی۔ کیا اسلامی نظام کے قیام کے لئے کوشش کرنے والوں کو جمہوریت قائم کرنے کے لئے کچھ الگ کرنا ہوگا؟ آپ نے غور فرمایا کہ وہی بات فریقِ مخالف کہے تو الحاد و زندقہ۔ اور وہی بات امیر جماعتِ اسلامی ارشاد فرمائیں تو عینِ اسلام، اور ایسی ایمان افروز کہ اس سے "دلوں میں یقین کی قندیلیں روشن ہو جائیں اور ان کی ضو چہروں سے پھوٹنے لگے"۔ (ایضاً) سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ

میں جو چُپ بیٹھوں سڑی کہلاؤں
شیخ چُپ بیٹھے تو کل ٹھہرے

باقی رہا "فسطائی نظام" کا طعن۔ سو اگر جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات بھول گئے ہوں تو ہم انہیں ان کے امیر کے یہ الفاظ یاد دلا دیں کہ

اس نوعیت کا اسٹیٹ (یعنی مودودی صاحب کے تصور کا اسلامی اسٹیٹ) ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی)

باقی رہی جمہوریت۔ سو (خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بات اور ہے) مودودی صاحب کے ذیل کے الفاظ ان کے اعمال نامے سے فرشتے بھی نہیں مٹا سکتے۔

پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا، وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۴ھ - ص ۲۹)

———(٠)———

۴۔ گھر بیٹھے لطف اٹھائیے

مودودی صاحب اپنے درسِ قرآن و حدیث کے بعد سامعین کے استفسارات کے جواب دیتے ہیں۔ ۱۴ جون ۱۹۶۹ء کے ایشیا میں کچھ سوالات اور ان کے جواب شائع ہوئے ہیں۔ آپ بھی اُن سے لطف اندوز ہو جیئے:۔

سوال:۔ مومنین کے بچوں کا جنت پر حق ہے اور کفار کے بچوں کا نہیں۔ اسکی کیا وجہ ہے؟ جبکہ سب بچے پیدائشی طور پر مسلم ہوتے ہیں۔ بعد میں ان کے والدین انہیں یہود و نصاریٰ یا ہنود یا کچھ اور بنا دیتے ہیں۔

جواب:۔ میں ابھی درس میں وضاحت کر چکا ہوں کہ کفار کے بچے اہلِ جنت کے خادم بنا دیئے جائیں گے۔ اور یوں دوڑتے پھریں گے جیسے موتی بکھرے ہوئے ہوں۔ لیکن اہلِ ایمان کے بچے انکے پاس ہی رہینگے اور ان سے کوئی خدمت نہیں لی جائے گی۔

اس بات کو سمجھ لیجئے کہ کفار اور مومنین کے بچے اپنے ذاتی استحقاق کی بنا پر جنت کے مستحق نہیں ہوں گے کیونکہ جنت تو نیک اعمال کی جزا ہے اور بچوں کا نامۂ اعمال بالکل صاف ہوتا ہے وہ ابھی دنیا کی عملی زندگی میں قدم بھی نہیں رکھتے کہ اس جہان سے سدھار جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اعمال کی بنیاد پر ان سے کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ جو مومنین کے بچے ہیں انہیں تو اپنے والدین کی جزا کے طور پر جنت میں ان سے ملا دیا جائیگا کیونکہ جب وہ چھوٹے چھوٹے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے والدین نے محض اللہ کی رضا کی خاطر صبر کیا اور اس صدمے کو یہ کہہ کر برداشت کر لیا کہ اے اللہ! یہ تیری امانت تھی تو نے واپس لے لی۔ ہم ہر حال میں صابر و شاکر ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں اس صبر کی جزا اس صورت میں دیگا کہ جنت میں ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان سے ملا دیا جائے گا۔ لیکن کفار کے اعمال کی جزا کا تو سوال ہی نہیں ہوتا اسلئے ان کے بچوں کو اہلِ جنت کا خادم بنا دیا جائے گا۔ رہیں گے وہ جنت میں ہی، لیکن اہلِ جنت کے خادم کی حیثیت سے رہینگے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

طلوعِ اسلام:۔ سوال یہ ہے کہ کفار کے یہ بچے کس جرم کی پاداش میں، مومنین کے بچوں کے خادم بنائے جائینگے؟ خدا کے ہاں سے اگر جزا کسی نیک عمل کے بدلہ کے سوا نہیں ملتی تو سزا بھی کسی جرم کی پاداش کے سوا نہیں مل سکتی۔

باقی رہا خود جنت میں داخلہ، سو اس کے لئے خدا کا ارشاد تو یہی ہے کہ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۴۳/۷۲) یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے بدلے میں وارث بنائے گئے ہو۔ مودودی صاحب کے پاس اگر جنت کے کوئی (SPECIAL PASSES) ہیں تو اور بات ہے جن کی بنا پر وہ انہیں بھی داخلِ جنت کر سکتے ہیں، جنہوں نے کوئی عمل نہ کیا ہو۔

اور آگے بڑھیے۔

سوال:۔ آپ نے جنت میں ان خدمت گذار لڑکوں کے بارے میں تشریح کی ہے جو ہمیشہ جوان رہیں گے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ غالباً یہ لڑکے کفار کی نسل سے پیدا ہوئے ہوں گے اور کم سنی میں انتقال کر گئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ کفار کی لڑکیاں بھی کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی۔ انہیں جنت میں کیا بنایا جائے گا؟

جواب:۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا البتہ میرا یہ قیاس ہے کہ جنت میں جو حوریں ہوں گی وہ یہی کفار کی لڑکیاں ہوں گی۔

طلوع اسلام:۔ اور مومنین کی لڑکیاں کیا بنیں گی؟

اور یہ بھی خوب رہی۔ دنیا میں کفار کی لڑکیوں کے ساتھ مسلمانوں کا نکاح حرام ہے لیکن جنت میں مسلمانوں کو کفار کی لڑکیاں بطور حور ملیں گی۔ وہاں غالباً کفر و اسلام کا امتیاز ختم ہو جائے گا ـــــ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے! ـــــ کیا بات ہے ان حضرات کے "اسلام" کی جس کی رُو سے کفار کی جو عورتیں جنگ میں قید ہو کر آجائیں انہیں بلا قید تعداد و بلا نکاح اپنے استعمال میں لائیے اور جی بھر جانے پر انہیں فروخت کر دیجئے (مودودی صاحب کی تفہیم میں ایسا ہی لکھا ہے)۔ اور ان کی جو بچیاں مر جائیں قیامت تک ان کا پیچھا کیجئے، اور جنت میں انہیں حوریں بنا کر اپنے قابو میں لے آئیے۔ (SEX - PERVERSION) کی اس سے گھناؤنی مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

فرضیت نماز

سوال:۔ آپ نے درس قرآن میں فرمایا ہے کہ نماز پنجگانہ بتدریج نازل ہوئی ہے لیکن احادیث میں آتا ہے کہ حضورؐ جب معراج پر تشریف لے گئے تو پہلے پچاس نمازیں روزانہ کا حکم ہوا پھر آپؐ کی بار بار درخواست کے بعد پنجگانہ نماز پڑھنے کا حکم ملا۔ براہ مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب:۔ نماز کے اوقات تو پہلے بتا دیئے گئے تھے لیکن پنج وقتہ نماز کی فرضیت معراج کے موقع پر آئی ہے۔ اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنے کے لئے تو پچاس نمازیں بھی تھوڑی تھیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا سراسر احسان ہے کہ اس نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی درخواست پر پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم عطا فرمایا۔ اب اس زمانے میں لوگ ان پانچ نمازوں پر بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ یہ کم سے کم حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو اس نے اپنے بندوں پر واجب کیا ہے۔

طلوع اسلام:۔ یعنی نماز فرض بعد میں ہوئی تھی لیکن اس کے اوقات پہلے بتا دیئے گئے تھے۔ باقی رہی پانچ نمازوں پر آجکل کے لوگوں کی حیرت، سو یہ حیرت کوئی نئی نہیں جس روایت میں ہے کہ معراج میں پچاس نمازیں

فرض ہوئی تھیں اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ حضرت موسیٰؑ کے مشورے سے بار بار خدا کے ہاں جاتے رہے اور خدا اس تعداد میں تخفیف کر دیتا تھا۔ آخر میں جب پانچ نمازیں رہ گئیں تو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ یہ بھی زیادہ ہیں تمہاری امت سے ان پر عمل نہیں ہو سکیگا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔

حدیث کو جمع کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ ابھی ایک حدیث میں آپ نے بتایا ہے جنگِ یمامہ کے موقع پر جب بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے جمع کرنے کی فکر ہوئی اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں لغت قریش پر لکھے ہوئے مصحف بلاد اسلامیہ میں بھیجے گئے۔ لیکن حضرات صحابہ کرامؓ نے آخر احادیث کو جمع کرنے کی طرف کیوں توجہ نہیں فرمائی؟

جواب:۔ اس کے متعلق قیاسات دوڑانے کی بجائے ہمیں اصل صورت حال کو سمجھ لینا چاہیئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم مسلسل ۲۳ سال تک نبوت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں آپؐ کا چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، کھانا پینا، عبادات میں مشغول ہونا، اپنے اصحاب کی تربیت فرمانا، کفار سے جنگ کرنا، حلیف قبائل سے معاہدے کرنا اور ایسے متعدد کام تھے جو شب و روز آپؐ سے ملے ہوتے رہے کسی کام کا آپؐ نے عملاً مظاہرہ فرمایا کہیں آپؐ نے زبانی ہدایت جاری کیں۔ کہیں کسی کام کرنے کا حکم دیا کہیں کسی سے روکا۔ اب ایک عقلمند خود سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ ساری چیزیں قلمبند کی جا سکتی تھیں ٹیپ ریکارڈ اور فلم کے موجودہ زمانے میں بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کے ہر قول و فعل کو ریکارڈ کر لیا جائے۔

قرآن کریم کو جمع کرنے کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے اسلئے فوری توجہ فرمائی کہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں اختلافات نہ واقع ہو جائیں اور سات حرفوں پر قرآن پڑھنے کی جو رعایت ابتداء دی گئی تھی کہیں وہ فتنے کا باعث نہ بن جائے۔ اسلئے ایک حرف (لغت قریش) پر قرآن کو جمع کر کے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس کے کل چھ سات نسخے تیار کرا کے بلاد اسلامیہ میں بھیجے گئے تاکہ لوگ ان مستند نسخوں کے مطابق اپنے اپنے نسخوں کی تصحیح کر لیں۔

جہاں تک حدیث کو جمع کرنے کا تعلق ہے۔ یہ کام بعد کے زمانے میں اس وقت شروع ہوا جب لوگوں کو مختلف امور میں حضورؐ کے قول و عمل کی تلاش ہوئی۔ یہی فرق ہے قرآن و حدیث کی اہمیت میں۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی صحیح صورت میں موجود ہے اور قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت

تھی جسے بعد میں جمع کیا گیا۔ قرآن کی اہمیت پہلے ہے اور حدیث کی بعد۔ لیکن جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہمیں حدیث کی ضرورت نہیں صرف قرآن ہی ہمارے لئے کافی ہے' وہ درحقیقت قرآن سے بھی اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

طلوعِ اسلام:- یہ توجیہات کسی تبصرہ کی محتاج نہیں لیکن ایک نکتہ وضاحت طلب ضرور ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ "قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت تھی جسے بعد میں جمع کیا گیا" سوال یہ ہے کہ اس قریب اڑھائی سو سال کے عرصہ میں جب حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں' قرآن کیسے سمجھا جاتا تھا؟

کیا خوش قسمت ہے وہ مفسرِ قرآن جسے اس قسم کے سامعین مل جاویں جو نہ صرف اس قسم کے جوابات سے وقتی طور پر مطمئن ہو جائیں بلکہ اگلی اتوار کو پھر درس کی مجلس میں آ بیٹھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ۔

ــــ ہم کو دعائیں دو تمہیں قاتل بنا دیا۔

(۔۔۔)

یادِ رفتگان

یہ خبر بزمہائے طلوعِ اسلام کے حلقوں میں بصد تاسف سنی جائے گی کہ بزم طلوعِ اسلام لیّہ کے بانی و روح و رواں' محترم شیخ غلام نبی صاحب۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر حرکت قلب بند ہو جانے سے ۲۱ مئی ۱۹۶۹ء کو اچانک وفات پا گئے۔

مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات سے نہ صرف بزم لیّہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے بلکہ لیّہ کے کئی ایک پرائیویٹ تعلیمی، علمی و ادبی ادارے جو ان کے حسنِ انتظام و حمیّتِ ملّی کی بدولت چل رہے تھے' ان میں بھی ایک بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

شیخ صاحب مرحوم کے پسماندگان میں دیگر بچوں کے علاوہ اُن کے اکلوتے فرزند ارجمند شیخ محمد فاروق ہیں جو اب ایل۔ ایل۔ بی کے آخری سال میں ہیں۔

ادارہ اس عزیز کے ساتھ اُن کے غم اور صدمۂ جانکاہ میں شریک ہوتے ہوئے دست بہ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عنایت کرے ہمیں توقع ہے کہ مرحوم کے خلف الصدق شمع قرآنی کے اسی طرح علمبردار ثابت ہوں گے۔　(ناظم)

طلوعِ اسلام کنونشن میں خطاب

طلوعِ اسلام کیا کہتا ہے؟

محترمہ محمدہ اسلام - نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

جب کسی ملک میں کوئی تحریک جنم لیتی ہے تو اس ملک کا حساس، تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ اس تحریک کا جائزہ لینے میں دو چیزوں کو سرِفہرست رکھتا ہے۔ اوّل یہ کہ وہ تحریک کن حالات اور تقاضوں سے متاثر ہو کر وجود میں آئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تحریک کا نصب العین و منشور کیا ہے؟ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے متعلق انہی دو امور کا جائزہ لیا جائے۔

حضرات! وہ دن یقیناً ابھی آپ بھولے نہیں ہوں گے جب تحریکِ آزادیٔ ہند میں مسلمانوں کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ یہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی ایک رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور افسوں کاریاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دے رہی تھیں۔ قوم کی صحیح راہ نمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر دشمنانِ حرم مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے جال میں پھانسنے کی تجویزیں کر رہے تھے۔ کہیں محراب و منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلود کر کے جغرافیائی حدود کے آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں امرھم شوریٰ بینھم کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیات بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس اولی الامر منکم کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ ایک طرف واردھا کی مستانے میں یہ خواب آور گیت گایا جا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے

اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ ہندو اپنے ذہن میں رام راج کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اس کے لئے انگریز یعنی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھوں فروخت کر دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کی آتشِ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صف میں کھڑے تھے اور ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ لوکر وڑ مسلمانوں کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا۔ یہ تھا وہ کس مپرسی کا عالم جس سے متاثر ہو کر محترم پرویز صاحب نے اس وقت چند صاحبِ ہمت دردمند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوتِ غور و فکر دی جن کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ بڑی بڑی اسکیموں، منشاندار پروگراموں، تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑ دیجئے۔ وقت آ گیا ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں "ایک ایک، دو دو کر کے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو پھر سوچو کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاعِ گم گشتہ اس کے اس چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جائے جو ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کا نقیب ہو اور ان کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآنِ کریم کی روشنی میں پیش کرے۔ اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کر سکے کہ قرآنِ کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں۔ بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک جا ہے اگر چلا جائے خدا کا یہ پیغامِ ازلی وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا اور جب تمام دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ (تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار رہ گئے) تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے عدمِ سکون و فقدانِ اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹی چلی آ رہی ہے، وہی نظام کارفرما ہوگا جو صرف قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے اور جس کے سوا اور کوئی نظامِ انسانی مشکلات کے حل کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

پھر خدا کے اس پیغامِ ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں۔ اور ان کا اسلوبِ بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوقِ ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کر دیں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دے کہ فی الواقع قرآنِ کریم خدا کی کتاب اور نوعِ انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہنِ انسانی کی ہر سطح کے مطابق اس کے اندر موجود ہے۔ ان حسین آرزوں اور

مقدس تمناؤں کے ساتھ طلوع اسلام کا اجرا ہوا۔

اس نے اعلان کیا کہ قوموں کی ہستی کا مدار ان کی مرکزیت پر ہوتا ہے۔ ان کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطۂ ماسکہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ان کی مرکزیت میں خلل و انتشار واقع ہو جائے تو ان کی ملی حیثیت کا شیرازہ اس طرح بکھر جاتا ہے جس طرح پرکار کا پاؤں مرکز سے ہل جانے سے پورے کا پورا دائرہ بگڑ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا انداز فکر ہی ہے جو تہذیب و تمدن کے محسوس پیکروں میں دنیا کے سامنے آتا ہے اور تہذیب و تمدن کی حفاظ اس قوم کی قوت و سطوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے پس پشت قوت و اقتدار موجود نہ ہو۔ یہ قوت و اقتدار ایک مرکز کا محتاج ہوتا ہے اور مرکزی تشتت و خلفشار بڑی سے بڑی قوت قاہرہ کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

اس نے متحدہ قومیت کے راگ الاپنے والوں کو للکارا اور کہا کہ اسلام میں قومیت کا مدار، نسل، رنگ، زبان یا وطن کا اشتراک نہیں۔ اس کا مدار دین کا اشتراک ہے جو لوگ دین میں مشترک ہیں وہ دنیا کے کسی خطے میں بستے ہوں کسی نسل سے متعلق ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ ایک ہی ملک میں بستے ہوں۔ اور ایک ہی نسل کیا، ایک ہی خاندان سے بھی متعلق کیوں نہ ہوں، اگر وہ دین میں مشترک نہیں تو وہ دو الگ الگ قوموں کے افراد ہیں۔ خاک وطن کی جاذبیت محض جذباتی چیز ہے۔

اس نے اعلان کیا کہ اسلام ایک زندہ نظام حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ قوانین خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض یا نظام مملکت کہتے ہیں۔ قرآن کی رو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بالآخر آزاد پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس روز پاکستان میں صدیوں کی غلامی سے نکلنے کے بعد خوشی کے جشن منائے گئے۔ ۱۴ اگست کو کراچی میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔

آزادی کی خوشیوں کا شور ابھی فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ منافقین (قوم پرست مسلمانوں) کا طائفہ جو کسی نہ کسی طرح تپ دق کے جراثیم کی طرح ہماری ہڈیوں کے گودے کے اندر تک پہنچ چکا تھا اب ناصح مشفق کے لباس میں دشمن کی سازشوں کو کامیاب بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ان غداران ملک و ملت کا منافق گروہ اس میں پیش پیش رہا جو شروع ہی سے ملت کے عزائم و مقاصد کا دشمن رہا تھا اور یہاں پہنچ کر اس نے اپنے آقایان نعمت کا حق نمک ادا کرنا شروع کر دیا۔ اب انہوں نے ایک دوسرا نقاب اوڑھا اور ملت کی قیادت میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے اور اس طرح پاکستان کے حمایتی بن بیٹھے۔ لیکن یہ حمایت بھی دراصل اس تخریب کے لئے تھی جس کی تبلیغ وہ اتنے عرصے کرتے چلے آئے تھے۔ انہوں نے نہایت غم خوارانہ انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر کہنا شروع کیا کہ اگر

مسلمان ہماری مان لیتے تو مصیبتوں کے یہ پہاڑ ان پر کیوں ٹوٹتے۔ اب ان مصیبتوں اور غلطیوں کا علاج یہ ہے کہ ملک کی قیادت حاملین شریعت کے ہاتھوں میں دے دی جائے اور حاملین شریعت میں ان کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے کیونکہ وہ مزاج شناسِ رسول ہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عناصر کی تخریب پسندیوں کو دیکھتے ہوئے ۱۴ اگست ۱۹۷۸ء کو محترم لیاقت علی خان صاحب وزیر اعظم پاکستان نے ریڈیو پاکستان کراچی سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> اہم ترین مشکل جو ہمیں پیش آرہی ہے، ایسے عناصر کی موجودگی ہے جن کا مقصد افتراق پیدا کرنا ہے۔ ان خود غرض اور گمراہوں نے نزاکتِ وقت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ایسی فضا پیدا کرنے کے درپے ہو گئے ہیں جو نوخیز مملکتِ پاکستان کو اگر ختم نہیں کر سکی تو بڑی حد تک درماندہ ضرور کر دے گی۔ ایسے لوگ واقعی پاکستان کے بدترین دشمن ہیں۔ یاد رکھیئے کہ ہم میں سے وہ لوگ جو اس طرح درپے تخریب ہیں ان کی ہمدردیاں بیرونی لوگوں کے خطرناک عزائم کی بہ نسبت ہمارے لئے خطرناک تر ہیں۔ لہٰذا میں پاکستانیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایسے لوگوں کی نقصان رساں سرگرمیوں سے ہوشیار رہیں۔

حضرات! موقع کی اس نزاکت اور تخریبی قوتوں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے طلوع اسلام کو پھر اسی طرح کمربستہ ہونا پڑا جس طرح تقسیم سے قبل قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ مضبوط کرنے اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے دشمن کی ایک منظم فوج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جو جبہ و دستار میں لپٹے ہوئے لات و منات کی طرح قال اللہ اور قال الرسول کا لبادہ اوڑھ کر، خدا اور تقاضائے ایمان کو دشمن کے ہاتھوں فروخت کر کے، دشمن کے آلۂ کار کی حیثیت سے آگے بڑھی تھی۔

اس نازک موڑ پر طلوع اسلام پھر قرآنی فکر و بصیرت کی قوتوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترا اور اس نے ان چھپے دشمنوں کو کھلے بندوں للکارا اور ساتھ ہی عوام کے قلب و نگاہ کی تربیت کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لئے صراطِ مستقیم کی واضح نشان دہی کی۔ یہ اس وقت سے آج تک مسلمانوں کی بیاستِ گم گشتہ اور اس کے چھپے ہوئے خزانوں سے اسے روشناس کرانے کی مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔

طلوع اسلام زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے۔ اس کی دعوت، تعین منزل (ایمان) اور حرکتِ پیہم (عمل) کی دعوت ہے۔

طلوع اسلام جس صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں نظام کی بنیاد عقیدۂ توحید

ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔ یعنی انسان کو خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآنی مملکت کے نظام میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے تقسیم عمل کے اصول کے مطابق مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ انسانیت کا نشوونما ارتقاء زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو خدائے رب العالمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومت الٰہیہ کا ضابطۂ آئین ہے۔ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آسکتی ہے اور نہ رسول اللہ کے بعد کوئی نبی۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ انسانی زندگی سے متعلق قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلمات اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ سب غیر متبدل ہیں۔ ایسے غیر متبدل کہ کائنات کی کسی شے کو، انسان سمیت، اس کی قدرت حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اس طرح امت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن تھامے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا، بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ قرآن کریم کا دعویٰ علم پر مبنی اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے

ماورا رہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے۔ اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ ذات پات یا رنگ، نسل، وطن کی تقسیم طاغوتی قوتوں کی پیدا کردہ ہے۔ قرآن کریم ذات پات کی اس تقسیم کو توڑ کر اس انقلابِ عظیم کا اعلان کرتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے اس لئے تمام روئے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک شجرِ بلند و بالا کی شاخیں ہیں۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی اختلافات کو مٹا کر مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امتِ واحدہ میں تبدیل کر دے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ آج بھی مملکتِ پاکستان کی سالمیت اور بقا و استحکام کا جذبۂ محرکہ وحدتِ مقصد کے سوا اور کوئی نہیں بن سکتا۔ جب ہم نے اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کی وجہ جواز کے طور پر اپنے آپ کو ایک قوم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا تو اس میں ایک قوم کے دعوے کی بنا اشتراکِ وطن، صوبے، رنگ، یا نسل کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بلکہ یہ بنائے اشتراک اسلام اور صرف اسلام تھا۔ دین و ایمان کی اشتراک کی بنا پر ایک قوم کی صورت میں متشکل ہونے کا مقصد یہ ہے کہ جن قرآنی اصول و اقدار پر ہم ایمان رکھتے ہیں انہیں پاکستان میں ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملاً متشکل کیا جائے۔ تاکہ قرآن کریم کی تعلیمات اور منشا و مقصود ایک زندہ حقیقت بن کر ہماری اجتماعی زندگی میں محسوس و مشہود طور پر رائج ہو۔ یہی وہ وحدتِ مقصد ہے جو ہمیں صحیح معنوں میں ایک قوم بنا سکتی ہے۔ اور جب یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے میں عملاً متشکل ہو جائے تو افرادِ ملت میں کوئی دوسری بنائے اشتراک باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ وحدتِ مقصد صوبائی اور نسلی عصبیتوں کا وجود تک ختم کر دیتی ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک ہے اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاستِ فرعونی کی ایجاد ہے۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کی مجلسِ مشاورت میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کا وجود قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ امتِ مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن حزب اللہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہے جو درحقیقت اعمالِ انسانی کا سرچشمہ ہے۔ عمل کا جذبۂ محرکہ قوتِ ارادی ہے اور قوتِ ارادی

کے منبع کو قلب کہا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے حیات، مرگِ باشرف کو کہتے ہیں اور موت، حیاتِ بے شرف کا نام ہے۔ زندگی مجاہدانہ تگ و تاز سے عبارت ہے اور بے عملی کا دوسرا نام موت ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ سب سے بڑی ابلیسیت جس کا مقابلہ انسان کو کرنا ہے، یاس و نا اُمیدی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہی امید و آرزو کا ہے۔ جب تک کسی سینہ میں آرزوؤں کی کرن موجود ہے، زندگی کی رمق باقی ہے۔ زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک درخشندہ نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کی تڑپ برق تپاں کی صورت میں رگ و پے میں جاری و ساری۔ ابلیس کا مشن یہ ہے کہ انسان پر یاس و نا اُمیدی اور حُزن طاری کر دے اور یہ جی چھوڑ کر کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس، فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کی قوتِ محرکہ ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ، عقل اور عشق، جنون اور خرد، ذکر اور فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے۔ جنون اور خرد جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنا دینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے۔ اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ہی اس سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو، یا روس کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ تمام نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں۔ لہٰذا باطل ہیں۔

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ مشرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ رسول اللہ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی۔ رسول اللہ کے بعد دین کا یہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت کے سرانجام پانے کا وہی طریقہ

تھا جو رسول اللہ کے زمانہ میں تھا۔ یعنی قرآن کریم کی اطاعت۔ اس طریقہ کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت کرائے۔ یہ اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے اس نظام کے چلانے والوں کو اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع کرنی ہوگی۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوع انسان کو بھوک و خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اور اس طرح اُس کی توانائیاں اور صلاحیتیں حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ اسلامی معاشرہ خدا کی رزق دینے کی ذمہ داری کو اپنے سر پر لیتا ہے۔ اس لئے قرآنی معاشرہ میں رزق کے سرچشمے خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ افراد معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ رزق کے یہ سرچشمے نہ معاشرہ کی ملکیت ہوتے ہیں نہ ملکت کی بلکہ معاشرہ یا مملکت اس کی منتظم ہوتی ہے۔ اس طرح دولت کا افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ جو ملکت اس قسم کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے وہ افراد سے ایک معاہدہ کرتی ہے جس کی رُو سے مملکت کے افراد اپنی جان و مال اللہ کے نام پر قائم شدہ مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں اور مملکت انہیں اس کے عوض جنت ارضی کی ضمانت دیتی ہے اور خدا جنت اُخروی کی۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فکر و نظر کی جس پریشانی و خلفشار اور خیالات و معتقدات کے افتراق میں مبتلا چلا آ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح تعلق کا عدم تعین ہے یعنی اس نے قرآن اور تاریخ کا مقام متعین نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح مقام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ اگر ہم قرآن کو اس کا صحیح مقام دے دیں اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بیشتر مشکلات کا حل آج ہی مل جائے۔

طلوع اسلام کہتا ہے کہ یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور

کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغامِ مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کیلئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحبِ ضربِ کلیم کا حریف نہیں ہو سکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اسی طرح رہنے دیتی ہے لیکن اُن کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کیساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن ہماری پوزیشن اس لحاظ سے اُن سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور انکا مفہوم بھی خود ہی متعین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کر لیں اور ان غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر وہ توانائی عطا کر دینگے جو نہ صرف خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دیگی۔

حضرات! پورے عالمِ اسلام میں ادارہ طلوعِ اسلام ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے چار و نطرف سے چھائی ہوئی مایوسیوں میں مسلمانوں کو پکارا اور بتایا کہ ان کی ذلت و رسوائی کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور اس کی عطا فرمودہ روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔ مسلمانوں کی بازآفرینی کے لئے یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ جس طرح خدا کی دی ہوئی روشنی نے اس قوم کو آج سے چودہ سو سال پہلے ترقی اور عروج کے بامِ ثریا تک پہنچا دیا تھا یہ قوم پھر اسی مینارۂ نور سے کسبِ ضیاء کرے اور اپنی زندگی کو اسی قالب میں ڈھال لے۔

ادارہ طلوعِ اسلام قریب تیس سال سے قرآن کریم کی آواز کو بلند کر رہا ہے اور بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہے کہ اسنے طلوعِ اسلام کی آواز میں وہ برکت عطا کی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے حساس تعلیم یافتہ اور سنجیدہ طبقہ کے زاویۂ نگاہ میں امید افزا تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی یہ آواز اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اسکا سیلِ رواں مخالفت کی خس و خاشاک سے رُک نہیں سکتا۔ جن سروں میں خدا کی اس کتابِ عظیم کا سودا سما جائے ان کی زبانیں اس تذکرہ سے کیسے رُک سکتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بلند و بالا مقصد کے حصول کیلئے وقف ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ابدی حقائق تابندہ ستاروں کیطرح جگمگ جگمگ کرتے دنیا کے سامنے آجائیں اور خدا کا متعین کردہ نظام، دنیا میں عملاً متشکل ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی جن تاریکیوں میں الجھ کر صدیوں سے کراہ رہی ہے وہ تاریکیاں چھٹ جائیں۔

(باقی)

خورشید عالم

استعمار کا عالمی کردار ۴

اب تک اس عنوان کے تحت جو گفتگو ہو چکی ہے اس سے یہ واضح ہو جانا چاہیئے کہ سیاسی آزادی استعمار کی بے دخلی کی تمہید تو ہو سکتی ہے لیکن عملی بے دخلی نہیں ہو سکتی۔ سیاسی طور پر غلام قوموں کو تاجِ آزادی دے کر صرف پینترا بدلا ہے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی ہے اور کئے جا رہا ہے کہ آزادی کا بھرم تو قائم رہے لیکن نو آزاد قومیں عملاً غلام رہیں اور سابق آقاؤں کو اپنا دوست سمجھ کر اپنے آپ کو اس طرح آزادی سے ان کے حوالے کر دیں جیسے غلامی میں وہ مجبوراً ان کے رحم و کرم پر تھیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد عالمی استعمار کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں چلی گئی اور یورپ کی استعماری قومیں اس کی طفیلی بن کے رہ گئیں۔ اب جہاں جہاں یورپ کی کسی قوم کا تسلط دکھائی دیتا ہے وہ کہنے کو اس قوم کا اپنا ہے ورنہ حقیقت میں وہ امریکہ ہی کا ہے اور اس قوم کی حیثیت امریکہ کے کارندے سے زیادہ نہیں۔ ایسی ایک مثال افریقہ میں پرتگال کی ہے۔ یہ ملک اپنے زور سے افریقی مقبوضات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا لیکن یہ ان سے دستکش ہونے کے لئے تیار نہیں، اور ایک دنیا دیکھ رہی ہے کہ کندھے تو اس کے ہیں لیکن بندوق امریکہ کی ہے۔ گویا امریکہ کی کوشش یہ ہے کہ جہاں کوئی یورپی قوم ابھی تک قابض ہے وہ بدستور قابض رہے اس کا تبضہ برقرار رکھنے کے لئے وہ اس کا پشت پناہ ہوا ہے۔ جہاں کوئی یورپی قوم اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتی وہاں مقامی صورتِ حال کے مطابق امریکہ کا رویہ اس طرح کا ہے کہ اپنی مرضی کے لوگ اقتدار کے وارث بنا دیئے جائیں۔ اور ان پر الطاف و اکرام کی بارش ہوتی رہے تاکہ نظمِ سیاسی و معاشی استعماری دور ہی کا رہے اور استعمار کو جو فائدے سیاسی تسلط سے حاصل ہوتے ہیں وہی آزادی کے بعد بھی حاصل رہیں۔ ایسا قریباً ہر ملک میں کیا گیا۔ البتہ آزادی سے پہلے اگر کسی ملک میں "باغی" قسم کی قیادت ابھرتی دکھائی دی تو آزادی اس وقت تک مؤخر کر دی گئی جب تک وہ "بغاوت" فرو نہ کر دی گئی۔ ملایا میں برطانیہ نے برسوں گوریلوں کے خلاف مہم چلائی اور انہیں سختی سے کچلا جب تک اسے فرو نہیں کر دیا گیا، انتقالِ اقتدار نہیں ہوا۔ انتقالِ اقتدار اس وقت ہوا جب یہ اطمینان کر لیا گیا کہ ایسے لوگ سامنے آ گئے ہیں جو کاروبارِ حکومت سنبھالیں گے اور اسے استعماری طرز ہی پر چلائیں گے۔ اس سلسلے میں انڈونیشیا

کی مثال خالی از دلچسپی نہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ ملک جاپان کے قبضے میں چلا گیا تو جاپان کے خلاف بغاوت کی طرح پڑ گئی۔ امریکہ اور اس کے طفیلیوں نے جاپان دشمنی میں حریت پسندوں کی مدد کی۔ بالآخر جاپان کو شکست ہوئی اور اسے انڈونیشیا سے بے دخل ہونا پڑا۔ بظاہر ہونا یہ چاہیئے تھا کہ انڈونیشیا آزاد ہو جاتا اور جو آزادی مجاہد جاپان کے خلاف پامردی سے اس وقت لڑے جب برطانیہ اور امریکہ شکست کھا کے بھاگ آئے تھے، وہ اقتدار سنبھال لیتے لیکن ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ انڈونیشیا برطانیہ کی تحویل میں دے دیا گیا اور یوں ہالینڈ کی واپسی کا راستہ صاف کیا گیا۔ بعد میں استعماری مکری حربوں کے علی الرغم انڈونیشیا آزاد ہو گیا۔ اس ملک اور اس ملک کی قیادت کو اس گستاخی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی کیونکہ آزادی کے بعد کے سالوں میں اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا گیا اور اس کے لئے کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھایا جاتا رہا۔ تا نکہ انتہائی خونریز تصادم پیدا کر کے اس قیادت کو ٹھکانے لگا دیا گیا اور اس ملک کو اس کے حلیفوں سے الگ رکھا گیا۔ انڈونیشیا ابھی تک مکر کی ان چالوں سے محفوظ نہیں اور وہ قیمت دیئے چلا جا رہا ہے۔ انقلاب قیادت کے بعد بھارت ایسے گماشتوں کے ذریعے اسے ایسے راہ پر رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اندرون ملک یہ اپنے نظم سیاسی و معاشی میں کوئی قابل ذکر تبدیلی پیدا نہ کر سکے اور بیرون ملک ایسی قوتوں سے تعاون نہ کر سکے جو استعمار کی مخالف اور اس سے برسر پیکار رہیں۔ ایک وقت تھا کہ انڈونیشیا اقوام متحدہ استعمار کے اکھاڑے سے باہر آ گیا تھا۔ اور پاکستان کے اس ادارے سے نکل آنے کا قوی امکان پیدا ہو گیا تھا۔ پھر قدرتی طور پر ایسے عالمی ادارے کے قیام کی باتیں ہونے لگیں تھیں جو استعمار سے پاک بھی ہو اور استعمار کا جواب بھی۔ لیکن نہ صرف پاکستان کے نکلنے کا راستہ روکا گیا بلکہ انڈونیشیا کو طرح طرح کی کوششوں سے پھر سے اقوام متحدہ میں لے آیا گیا اور اس تحریک کو کمزور کر دیا گیا جو عالمی سطح پر استعمار کے خلاف زور پکڑتی جا رہی تھی۔

قیادت بدلنے کا کھیل کم و بیش ہر ملک میں کھیلا جاتا ہے۔ جہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک قیادت اپنی غلط کاریوں کی بنا پر ضرورت سے زیادہ بدنام ہو گئی ہے، اسے ایسی ہی لیکن بظاہر نیک نام یا نسبتاً کم بدنام قیادت سے اس انداز سے بدل دیا جاتا ہے کہ عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ ایک ناخواندہ قیادت کو ملکی مفاد کے تحت بدلا گیا ہے اور مقصد اصلاح احوال ہے اور فلاح و بہبود عامہ۔ مقصد نہ یہ ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ ایسے افراد اور گروہ اُبھارے جائیں جو عوام کے خیرخواہ نہ ہوں انہیں سبز باغ دکھاتے رہیں، اپنے مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیں اور سامراج کو اپنا مربی سمجھیں اور اندرونی اور خارجہ پالیسیوں کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں دیئے رکھیں۔ عام ممالک میں ایسی تبدیلیاں پس پردہ کوششوں سے اس انداز سے لائی جاتی ہیں کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ اجنبی ہاتھ تاریں ہلا رہے ہیں یا اس کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ تبدیلیاں ہوتی بھی ایسی مناسب حال ہیں کہ یہی دکھائی دیتا ہے کہ جو افراد اور گروہ سامنے آئے ہیں یہ کیا کرایا انہی کا ہے۔ چنانچہ سامراج کے عزائم اور اس کی چالوں پر ایک طرح کا پردہ پڑا رہتا ہے اور متعلقہ ممالک

یں جو عناصر قدرے سنجیدگی اور نسبتاً قومی نقطۂ نگاہ سے سوچتے ہیں وہ تبدیلیوں کی خوبیوں یا خرابیوں کا ذمہ دار انہی افراد اور گروہوں کو سمجھتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق اصلاحِ احوال کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ انہی کے حوالے سے اور انہی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ ان کی کوشش قابلِ فہم بھی ہوتی ہے اور مرضی کا نتیجہ بھی پیدا کر سکنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جب بظاہر ان کی کوششوں سے تبدیلی آتی ہے تو تبدیلی یا تو پہلے قدم پر ہی ان کی توقع کے برعکس ہوتی ہے یا بدیہی اور ہنگامی طور پر قابلِ قبول بھی ہو تو کچھ وقت کے بعد تبدیلی سے پہلے کی طرح کی یا اس سے بھی بدتر صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے پھر سے پہلی سی کوشش کی جاتی ہے اور تبدیلی لائی جاتی ہے لیکن نتیجہ پھر وہی ہوتا ہے۔ اس سے بعض ملکوں میں یہ خیال ایک عقیدے کی شکل اختیار کر گیا ہے یا کرتا جا رہا ہے کہ ان کا معیارِ اخلاق، شخصی بھی اور سیاسی بھی، اس قدر گر چکا ہے کہ انہیں ملکی نظم و نسق کو چلانے کے قابل بنانے کے لئے ابھی بڑی تطہیر کی ضرورت ہے۔ اس کا جواب ان سے کچھ نہیں بن پڑتا کہ یہ تطہیر کیسے ہو۔ کہیں انفرادی کردار کو صاف کرنے کے دعوے باندھے جاتے اور منصوبے تیار کئے جاتے ہیں اور کہیں انتظامی ڈھانچے میں افراد کے لئے میزان نصب کی جاتی ہے۔ بڑی دیانتدارانہ کوشش کر کے دیکھ لی جاتی ہے لیکن نتیجہ حسبِ منشا نہیں نکلتا اور اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کا دھیان نہ ادھر جاتا ہے نہ جانے دیا جاتا ہے کہ خرابی کہیں اور سے پیدا کی جا رہی ہے اور جب تک وہ منبع بند نہیں کر دیا جائے گا، قومی سطح پر تطہیر نہیں ہو سکتی۔

سامراج اور ملکوں میں تو ہیں پردہ کام کرتا رہا ہے اور کرتا جا رہا ہے لیکن دیت نام میں آ کر یہ عریاں ہو گیا ہے۔ لیکن عام ذہن ابھی تک ایسے صاف نہیں ہوئے اور نہیں ہونے دیئے جا رہے کہ وہ اس عریانی کو صحیح سمجھ کے اپنے لئے نتائج اخذ کریں اور سامراج کی چالوں کو سمجھیں بھی اور قومی سطح پر ان سے گلو خلاصی بھی کرائیں۔ یہ سامراج ہی کا کمال ہے کہ وہ یہ تاثر دینے میں کہیں کہیں کامیاب دکھائی دیتا ہے کہ دیت نام میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دیت نام تک ہی محدود ہے اور اس کے مخصوص حالات کا نتیجہ ورنہ ایسا کہیں اور نہ ہو سکتا ہے نہ ہوگا۔ نیز دیت نام میں بھی یہ سب کیا کرایا استعمار ہی کا نہیں بلکہ مقامی لوگوں کا ہے یعنی ان کا ہے جو بیرونی (یعنی چینی) اثر قبول کرنے کے لئے اس لئے تیار نہیں کہ یہ قومی خودی کے منافی ہے۔ اتنا فریب دیکر یہ مزید فریب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ استعمار کا کردار دیت نام میں اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ان عناصر کو تقویت دے جو قومی جذبے سے سرشار ہو کر چینی یعنی بیرونی اثرات سے اپنے ملک کو بچانا چاہتے ہیں۔ اس جذبے کی تشہیر کی جاتی ہے اور اس کی تقدیس دلوں میں بٹھائی جاتی ہے لیکن اس کا ہدف چین کو بنا کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ محبِ وطن دیت نامی چین کے غیر ملکی اثر کو روکنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اگر مقصد غیر ملکی اثر روکنا ہے تو وہ چین کا ہو تو بھی روکنا چاہیئے اور امریکہ کا ہو تو بھی روکنا چاہیئے لیکن نہیں۔ شمالی

گویا اور ویت کانگ امریکی اثر کے خلاف سینہ سپر ہوں تو وہ چین کے طفیلی کہلائیں اور جنوبی ویت نام کے افراد اور گروہ چین کے اثر کو رد کرنے کا دعویٰ کریں تو وہ محبِّ وطن کہلاتے ہیں۔ ایسے محبِّ وطن جو امریکہ کی اخلاقی، مالی اور فوجی امداد کے اس حد تک مستحق کہ امریکی فوجیں وہاں پہنچ کر اس بھاری تعداد میں لڑیں کہ لڑائی ویت نام کی نہیں امریکہ کی ہو جائے۔

ویت نام میں امریکہ براہِ راست لڑنے پر اسلئے آ گیا ہے کہ ویت نام کے خمیر سے وہ عوامی قیادت اُبھر آئی ہے جو استعمار کی ضد ہے۔ اس قیادت نے یہ ناممکن بنا دیا ہے کہ امریکہ کو ایسے کارندے ملیں جو ویت نام میں سامراجی نظم سیاسی و معاشی چلائے رکھیں اور ویت نام سے باہر سامراجی گماشتے بنے رہیں۔ امریکہ نے سیگاؤں میں اپنے مطلب کے ٹوڈی اور افراد چن چن کر آگے بڑھائے لیکن عوامی قیادت کی رو ویت نام میں اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ یہ گماشتے مؤثر نہیں ہو سکتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ویت نامی حریت پسند ہوتے ہیں تو جنگلوں میں بے سر و سامان لڑتے ہیں اور ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ امریکہ تو کیا ایک عالم دنگ رہ جاتا ہے۔ لیکن یہی ویت نامی جب نام نہاد جنوبی ویت نام کی حکومت کے سپاہی بنتے ہیں اور امریکہ کے جدید اور وافر اسلحے سے لیس ہوتے ہیں تو پھسڈی اور بزدل ہو جاتے ہیں۔ اس تضاد نے امریکہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ویت نامیوں کو ویت نامیوں کے خلاف لڑا تو سکتا ہے لیکن خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے یہ فریب تو برقرار رکھا کہ اصل میں ویت نامی رضاکارانہ طور پر اور اصول کی خاطر ان ویت نامیوں سے لڑ رہے ہیں جو چین کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں لیکن اس نے اتنی کثیر تعداد میں اپنی فوج وہاں پہنچا دی کہ عام دنیا تو اس فریب میں کیا مبتلا ہو گی خود امریکہ میں یہ شور مچنے لگ گیا کہ ویت نام میں محبِ وطن چین پرستوں کے خلاف نہیں لڑ رہے بلکہ امریکہ ویت نام کے خلاف لڑ رہا ہے۔ ویت نام کی مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سامراج کس حد تک جانے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ ایسا مظاہرہ ویت نام کی انتہائی مثالوں میں ہو گا ورنہ دوسری جگہوں پر ایسے عریاں مظاہرے کی نوبت حتی الوسع نہیں آنے دی جا رہی۔

ایسی مثال بھارت کی ہے جہاں سامراج مقابلتاً زیادہ عریاں ہو کر ناچنے لگا ہے۔ بھارت میں آزادی کے بعد سے مسلسل ایسی قیادت برسرِ اقتدار رہی جو سامراج کی حلقہ بگوش ہے۔ اس سے شروع ہی سے امتیازی سلوک روا رکھا گیا۔ جب امریکہ غیر جانبداری کو ایک گناہ سمجھتا تھا اس وقت بھی بھارت کی غیر جانبداری کو گوارا کیا گیا۔ اسے گوارا ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس سے اپنا الو سیدھا کیا جاتا رہا۔ امریکہ نے کسی قسم کا رسمی فوجی معاہدہ کئے بغیر بھارت کو فوجی اور معاشی امداد دی اور خوب فیاضی سے دی۔ اس نے اس میں بھی مصلحت دیکھی کہ روس بھی بھارت میں آ موجود ہو اور بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ امریکہ کا حلیف بن جائے۔ چین کی حیران کن ترقی نے امریکہ اور روس کو ایک دوسرے کا حلیف بنا دیا ہے۔ چنانچہ اب دونوں مل کر بھارت کو اعلیٰ درجے کی طاقت بنا رہے ہیں۔ بظاہر یہ تصور ابھارا جا رہا ہے کہ

برطانیہ نے سویز کے ادھر سے بے دخل ہوجانے کا جو اعلان کر رکھا ہے یہ تیاری اسی خلا کو پُر کرنے کے لئے کی جا رہی ہے۔ گویا ایک ایشیائی ملک "بھارت" کو اس کے لئے تیار کیا جا رہا ہے کہ جو ذمہ داری پہلے برطانیہ پوری کر رہا تھا وہ ایک ایشیائی ملک ہی کرے۔ گو ان تیاریوں کا محور بھارت ہے تاہم اور ایشیائی ممالک کو بھی آمادہ بہ تعاون و اشتراک کیا جا رہا ہے۔ یہ ذمہ داری ایشیائی برادری ہی کے سنبھالنے کی ہے لیکن سامراج کی کوشش یہ ہے کہ ایسے ایشیائی ممالک سامنے لائے جائیں جو ان کے معتمد ہیں اور وہ سامراج کے حلقہ بگوش بن نہ بھی گئے ہوں تو ان سے یہ خدشہ نہ ہو کہ وہ آگے چل کر سامراج کے منہ آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کو سرفہرست رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جیسے نام نہاد ایشیائی ممالک کا نام لیا جاتا ہے۔ انڈونیشیا کو پھانسنے کی پوری کوشش ہو رہی ہے مگر انقلاب قیادت کے باوجود یہ ملک ابھی تک اعلانیہ بھارت کا ساتھی اور سامراج کا آلہ کار بننے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

برطانیہ کی بے دخلی سے پیدا ہونے والے خلا کو "پُر" کرنے کو تو بھارت ایسے ایشیائی ملک سے کہا جا رہا ہے، لیکن یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ سامراج کو صرف بھارت کا کندھا چاہیئے۔ بندوق بھارت کے اندر تیار ہو یا باہر سے تیار ملے، ہوگی سامراج ہی کے ہاتھ میں۔ بھارت کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ بالکل وہی ہے جو سامراج نے تیار اور رائج کیا اور سامراج جس کا تحفظ اور چلن چاہتا ہے۔ جب تک ڈھانچہ موجود ہے بھارتی قیادت سامراج کی ایجنٹ ہی ہو سکے گی۔ یہی نہیں بلکہ ہر طرح کی اور بے دریغ فوجی مدد سے بھارت کو ایک چھاؤنی بنا دیا گیا ہے۔ پورے ملک کو چھاؤنی بنانا تو آسان ہے لیکن اس چھاؤنی کا سامراج کا قلعہ بنے رہنا مخدوش ہے۔ توجہ کا مرکز صرف یا زیادہ تر فوجی ساز و سامان اور اس کی پیداوار اور رسد ہو تو معاشی ناہمواریاں تیزی سے پیدا ہونگی۔ سامراج کسی ملک کو اس پہلو سے خود کفیل کیوں نہ بنا دے —— جیسے بھارت بنتا چلا جا رہا ہے —— اس کے اندر سے بغاوت پھوٹے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ بغاوت ان ناانصافیوں کے خلاف ہوتی ہے جو معاشی اور معاشرتی مسائل سے روگردانی کر کے سامراج کے اشاروں پر عسکری قوت بنتے چلے جانے کا ناگزیر نتیجہ ہوتی ہے۔ بھارت گہرے ہیجان کا شکار ہے۔ اس میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن سامراج نے ابھی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ چین کی شہ پر ہو رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے چین کے اشتراکی لٹریچر اور جنگی اسلحہ کا جو کئی راستوں سے بھارت میں پہنچ رہا ہے۔ گویا جو عناصر معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں سے تنگ آکر آمادہ بہ بغاوت ہو رہے ہیں انہیں ابھی سے چین پرستی کا داغ دیا جا رہا ہے۔ کل یہ عناصر زور پکڑ جائیں گے تو سامراج کھل کر میدان میں آئے گا اور پھر بھارت ویت نام کا نقشہ پیش کرے گا۔ جو لوگ آج اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھارت میں آزادی بھی ہے اور جمہوریت بھی' اور امریکہ (اور روس) کی سامراجی کارستانیاں وہاں نہ مؤثر ہیں نہ ہو سکیں گی۔ وہ یا تو دوسری عالمی جنگ کے بعد سے استعمار کے کردار

سے بے خبر ہیں یا ویت نام کے پس منظر کو دانستہ فراموش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ویت نام بھارت میں دہرایا جائے گا اور سامراج یہاں بھی اتنا ہی عریاں ہوگا جتنا وہاں ہے۔ سامراج نے ویت نام میں جو کچھ کیا اور کر رہا ہے' وہ ویت نام سے مخصوص نہیں۔ وہ ایسے ہی حالات میں کہیں اور بھی ہو سکتا ہے۔ بھارت میں جب تک عوامی تحریک زور نہیں پکڑے گی۔ وہاں جمہوریت کا چرچا ہوتا رہے گا اور آزادی کے دعوے باندھے جاتے رہیں گے۔ جونہی ویت نام کی طرح عوامی رو تیز ہو گئی' سامراج اس کے مقابلے میں آجائے گا۔۔۔ پہلے برسرِاقتدار بھارتیوں کو "باغی" بھارتیوں سے لڑایا جائے گا اور پھر ان کے کچلے نہ جانے پر سامراج براہ راست ان کے روبرو ہو جائے گا۔ بحر افریشیا (بحر ہند) میں امریکہ اور روس جس طرح آموجود ہوتے ہیں اور وہ جس ڈھٹائی سے بھارت کو تیار کر رہے ہیں وہ اسی آنے والی خانہ جنگی کی تیاری ہے بعض لوگ حیران ہوتے ہیں کہ امریکہ اور روس بحر افریشیا میں چین کا مقابلہ کیسے کریں گے۔ اس سمندر میں چین سے تو براہ راست ٹکر نہیں ہو سکتی۔ یہ دراصل بھارت کے محاذ پر چین کا مقابلہ کیا جائے گا اور بھارت کو سامراج کا پٹھو بنائے رکھنے کے لئے اسے ویت نام بنایا جائے گا۔

مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں۔ ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں جگہ جگہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن جو مثالیں دی گئی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ سیاسی آزادی کے بعد استعمار بے دخل نہیں ہو گیا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ دخیل ہو گیا ہے۔ پہلے جو کچھ وہ مقبوضہ ممالک میں کرتا تھا' اب وہ نو آزاد ممالک سے کراتا ہے۔ ان ممالک میں حکومت کی معمولی تبدیلیاں ہوں یا بھارت کی جنگی تیاریاں ہوں' یا ویت نام کی جنگ ہو' سامراج کے دو ہی کے مختلف روپ ہیں۔ کس ملک میں کون سا روپ دکھائی دے گا' یہ اس ملک کے حالات پر منحصر ہے ورنہ سامراج کسی کا لحاظ کرنے کا روادار نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ سامراج سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے' تاکہ سیاسی آزادی صحیح معنوں میں مؤثر ہو۔ یہ جان لینے کے بعد کہ سامراج نو آزاد ممالک کے اندرونی معاملات میں اپنی مطلب براری کے لئے دخیل ہے' سامراج ملکی مسئلہ بھی بن جاتا ہے اور عالمی بھی۔ گویا اس کا مقابلہ ملک کے اندر بھی ہوگا اور ملک سے باہر بھی۔ ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور ایک کے لئے دوسرے کو ٹالا یا چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اندرونی مقابلے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسم کہن بدلی جائے جو سامراج نے ڈالی تھی اور جس لکیر کو نو آزاد ممالک بلا سوچے سمجھے پیٹے چلے جا رہے ہیں اسے چھوڑ دیا جائے۔ مغرب کا جمہوری نظام استعماری اور استحصالی ہے۔ یہ ایک خاص طرح کے طبقات کو ابھار کر اوپر لاتا ہے اور غالب اکثریت کو غیر مؤثر بنانے کے کام آتا ہے جس جمہوریت یا جمہوریت کا جو چرچا جگہ جگہ ہوتا ہے' اسے کسی پہلو سے دیکھا جائے اور کسی طور پر رائج کیا جائے اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ ایک طبقہ سامنے آئے گا تو دوسرا اسے ہٹانے میں لگ جائے گا۔ یوں طبقے آپس میں ٹکراتے رہیں گے اور ماہی پوچھتی پھرے گی۔۔۔ دریا کہاں ہے! بلکہ دریا نہیں۔ دریا وہ عوام ہیں جو دیہات میں آباد ہیں اور جن کا کوئی پرسانِ حال

نہیں ہوتا۔ ترقیاتی منصوبے انکی گردنک کو بھی نہیں چھوتے ان منصوبوں سے افراطِ زر پیدا ہوتا ہے اور افراطِ زر سے اشیائے ضرورت مہنگی ہوتی ہیں۔ عوام ترقی کا فائدہ تو نہیں اٹھاتے لیکن اس مہنگائی کی سزا ضرور بھگتتے ہیں۔ انہیں حق رائے دے بھی دیا جائے تو وہ آزادی سے اُسے استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک بڑے زمیندار کے مزارع اور ایک بڑے کارخانہ دار کے مزدور ووٹ دے سکتے ہیں لیکن ووٹ سے اس ظلم کو بدل نہیں سکتے جو ان سے روا رکھا جا رہا ہوتا ہے۔ ان کے ووٹ اس وقت آزاد ہوں گے جب بڑے زمیندار اور کارخانے دار ان کے آن داتا نہیں رہیں گے اور جمہوریت اور آزادی کو اپنے اثر سے بے معنی نہیں بنا سکیں گے۔ کاشتکار زمینوں کے اور مزدور کارخانوں کے مالک بنائے جائیں اور حقِ ملکیت انہی کا تسلیم کیا جائے تو ملک کی غالب اکثریت اپنی مرضی سے ووٹ دے سکے گی کیونکہ وہ کسی کے زیر اثر نہیں ہوگی۔ یہ حقِ ملکیت ایک خاص قسم کی جدوجہد سے حاصل ہوگا کسی کی طرف سے انعام نہیں ملے گا۔ اس جدوجہد کے بعد جمہوریت کو جمہوریت اور آزاد کہا جائے گا۔ یہ نظام استبداد اور استحصال سے پاک ہوگا لہٰذا سامراج کا آلۂ کار نہیں بن سکیگا۔

اندرونِ ملک یہ جدوجہد اپنی جگہ، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ سامراج کو عالمی سطح پر کمزور کیا جائے۔ ایسا ان ممالک کے اشتراک سے ہو سکیگا جو سامراج کے کردار کو سمجھ چکے ہیں اور اپنے ہاں اس کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ بغیر عالمی اشتراک کے سامراج کو باہر سے کمزور نہیں کیا جا سکے گا۔ ایسی طرح اس افریشیائی کانفرنس میں پڑ گئی تھی جو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کے مقام پر منعقد ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں اسے الجزائر میں دوبارہ منعقد کیا جانے لگا تو اس ملک میں ایسا اندرونی انقلاب آیا کہ اس کا انعقاد ناممکن ہو گیا۔ آج تک اس کا انعقاد نہیں ہو سکا۔ اسے اور ناممکن بنانے کے لئے علاقائی اشتراک پر زور دیا جاتا ہے۔ کہیں غیر جانبداروں کو اکٹھا کیا جاتا ہے، کہیں دفاعی تنظیمیں بنائی جاتی ہیں، کہیں علاقائی معاشی تعاون کا چرچا ہوتا ہے۔ یہ استعمار ہی کے حربے ہیں۔ وہ ان چالوں سے اس اشتراک کو ناممکن بنا رہا ہے جو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں استعمار کے عالمی مقابلے کے لئے ناگزیر ہے۔ استعمار کے کردار کو سمجھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک کو فروغ دیں اور خلافِ استعمار عالمی محاذ قائم کرنے میں لگے رہیں تاکہ وہ اندرونی اور بیرونی طور پر استعمار کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ ہوں اور انسانی اقدار کا دور دورہ ہو۔

اطلاع

پرچہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک آپکو پرچہ نہ ملے تو ۱۵ تاریخ تک ادارہ کو اطلاع دیں۔ آپکو پرچہ دوبارہ ارسال کر دیا جائے گا۔

نیز

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور لکھا کریں۔ ناظم